قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۲۷	کراچی : ہفتہ ۔ ۶ ۔ اگست ۱۹۵۵ء	قیمت چھ آنہ سالانہ پندرہ روپے

قرآن نے کیا کہا ؟

دنیا کا نظام کچھ اس قسم کا چلا آرہا ہے کہ ہر شخص کی ذمہ داری اسکی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسے اپنی روٹی کپڑے کا انتظام خود کرنا ہوتا ہے۔ اپنی بچوں کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اسکے اپنے ذمہ ہوتا ہے۔ اگر ایک مزدور، صبح سے شام تک کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے لیکن اسے کام نہیں ملتا اور اسطرح شام کو وہ اور اسکے بیوی بچے بھوکے رہ جاتے ہیں، تو اسکی ذمہ داری معاشرہ میں کسی پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر کسی بیوہ کا نوجوان لڑکا کسی دیوار کے نیچے آکر مر جاتا ہے تو اسکی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہوتی کہ وہ دیکھے کہ اس بیوہ اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا گزارہ کیسے ہوگا۔ مرنے والا تو مر گیا۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں وہ اپنی مصیبت آپ بھگتیں۔ اگر کسی گھر میں کمانے والا بیمار پڑ گیا ہے اور گھر والوں کے پاس نہ اسکے علاج کیلئے کچھ ہے نہ کھانے پینے کیلئے۔ تو اسکے علاج اور گھر والوں کے کھانے پینے کے انتظام کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہوتی۔ وہ مریں یا جئیں۔ اس سے کسی کو سروکار نہیں ہوتا۔

دنیا کا یہی نظام ہے۔ ہمارے معاشرہ کا بھی یہی انداز ہے لیکن اس باب میں قرآن کا مسلک کچھ اور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "وما من دابۃ فی الارض الاعلی اللہ رزقہا (۶/۱۱)"۔ انسان تو ایک طرف زمین میں کوئی جانور بھی ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

1. تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ اسے اپنی رہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی [illegible] منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. ہمارا دین کا معیار قرآن ہے۔ جزئیات جو قرآن کے خلاف ہوں [illegible] غلط قرار دے۔
4. حضور نبی اکرم نے انسانی معاشرہ کو اپنے بہترین نظام [illegible] قرآن کے بعد [illegible] سیرت [illegible] قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں [illegible] زندگی بسر کرے۔
6. اسی نظام کی [illegible] زندگی کی تشکیل کی صورت ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین مرتب کریں۔ (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی [illegible] معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام انسانوں کی [illegible] اور کوئی فرد و معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا [illegible] ربوبیت [illegible] تمام نوعِ انسانی کی [illegible] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
8. ربوبیت عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے [illegible] ہے کہ رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں [illegible] رزق کی تقسیم [illegible] اس طریق کو اسی لئے قرآنی نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں [illegible] قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے [illegible] تاکہ [illegible]۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ خان عبدالغفار خان	★ مہاجر بستیاں	★ انڈیا آفس لائبریری	★ عید اور ہائی
★ عورت کا قرآن	★ تاریخی شواہد	★ اسلام کی سرگزشت	★ مجلس اقبال
★ مسند امام احمد بن حنبل	★ حقائق و عبر	★ عالم اسلامی	★ بین الاقوامی جائزہ

As. -/6/-

انسان
نام ہے جسم اور نفس کا

ان دونوں کی پرورش اور تربیت نہایت ضروری ہے۔
لیکن یہ ہو کیسے؟
جسم اور نفس کے تقاضے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ہے وہ

مسئلہ

جسے حل کرنے کے لئے انسانیت سرگرداں چلی آرہی ہے۔
انسان نے اس کے بہت سے حل سوچے لیکن یہ مسئلہ
جوں کا توں رہا۔

اس کا صحیح حل
وحی نے دیا جو قرآن میں محفوظ ہے۔

یہ حل کیا ہے؟ اور یہ کیسے قابل عمل ہو سکتا ہے؟

اس کے لئے دیکھئے۔

✡ نظام ربوبیت ✡

(از - پرویز)

دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھہ روپے
قسم دوم: کاغذ سیکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ - چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ - کراچی-۳

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸ | ہفتہ ۶؍ اگست ۱۹۵۵ء | نمبر ۲۷

خان عبد الغفار خان

طلوعِ اسلام کی زندگی میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ کسی "شخصیت" کو لمعات کا زیب عنوان بنایا گیا ہے۔ قارئین کے لئے یہ استثناء یقیناً حیرت انگیز ہوگا، اور ایسا ہونا بھی چاہیئے، لیکن ہم ابتدائی سطور ہی میں اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ عنوان میں اگرچہ ایک شخص کا نام آیا ہے، اور متن میں بھی اس کا نام لے کر بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن اس سے کسی کی ذات یا شخصیت مقصود نہیں۔ چند اہم اصولی باتیں ہیں جن کے متعلق کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرنا ناگزیر ہوگیا ہے اور وہ باتیں نہیں کی جاسکتیں جب تک خان عبد الغفار خان صاحب کا نام بیچ میں نہ آئے۔

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہمارے نزدیک عبد الغفار خان صاحب ایسے ذاتی جوہروں کے مالک نہیں جن کی بناء پر ان کا نام لے کر خاص طور پر ان کا ذکر کیا جائے۔ نہ ہی انہیں مملکت پاکستان میں کوئی اہمیت حاصل ہے کہ انہیں کسی فکری تحریک کا محور بنایا جائے۔ ان کے متعلق ہماری صاف صاف رائے یہ ہے اور یہ رائے ان کے پورے سیاسی کردار کے مطالعہ کے بعد قایم کی گئی ہے کہ ان کے سامنے ہوسِ اقتدار اور نام کی شہرت کے سوا اور کوئی مقصد نہیں اور اس ذاتی مقصد کو وہ ہر ملی متاع کے عوض خریدنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران میں، ہندو نے ان کی اس نفسیاتی کمزوری کو بھانپا اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان کے نام کی شہرت کے جذبہ کی تسکین کے لئے انہیں "سرحدی گاندھی" کا لقب عطا کر دیا۔ اور ان کی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے انہیں سرحد میں قائد اعظم کا حریف قرار دے کر مسلمانوں میں ایسے بغض و عداوت کے بیج بو دیئے جن کے کانٹے ہمیں اس وقت تک چین سے نہیں سونے دیتے۔

اس وقت ہمارے سامنے خان عبد الغفار خان صاحب کی ۲۰ جولائی کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے اپنے داخلہ سرحد کے بعد مردان میں کی۔ اس میں انہوں نے شکایت کی ہے کہ تقدیر کی یہ ستم ظریفی عجیب ہے کہ جنہوں نے انگریز کو ہندوستان سے نکالا انہیں وہ لوگ غدار پاکستان کہہ رہے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ انگریز کے پیچھے چلتے رہے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر خان صاحب نے کہا یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے انگریز کو ہندوستان سے نکالا اس لئے وہ پاکستان کے غدار کیسے ہوسکتے ہیں؟ بفرضِ استدلال اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انگریز کو ہندوستان سے خان صاحب نے نکالا تھا۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ اس سے یہ نتیجہ کیسے برآمد ہو سکتا ہے کہ وہ غدار پاکستان نہیں ہیں۔ ہندوستان میں ہندو، انگریز کو اس لئے ہندوستان سے باہر نکالنا چاہتا تھا کہ وہ سارے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرے اور اپنی اکثریت کے زور پر مسلمانوں کو محکوم بنا لے۔ ان کے برعکس، مسلمان انگریز کو اس لئے نکالنا چاہتا تھا کہ اس کے بعد وہ اپنی اکثریت کے علاقوں میں اپنی حکومت قایم کرے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں جو مسلمان ہندو کی ہمنوائی میں انگریز کو ہندوستان سے نکالنا چاہتا تھا وہ اپنے آپ کو مسلمان کا بہی خواہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کا اسی طرح سے دشمن اور غدار تھا جس طرح سے ہندو۔ لہٰذا اگر کسی ایسے مسلمان کی تائید سے انگریز ہندوستان سے نکل گیا تھا تو اس سے وہ مسلمان ملتِ اسلامیہ کا بہی خواہ یا ان کے مفاد کا محافظ نہیں قرار پاتا۔ بنابریں، یہ دلیل پیش کرنا کہ جس شخص نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا تھا وہ پاکستان کا غدار کس طرح سے ٹھہرایا جاسکتا ہے، خود فریبی نہیں تو ابلہ فریبی ضرور ہے۔ خان عبد الغفار خان صاحب تو وہ ہیں کہ جب کانگریس تک بھی مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کو تسلیم کر چکی تھی تو یہ اس وقت بھی اس مطالبہ کی مخالفت کر رہے تھے۔ چنانچہ سرحد کا ریفرنڈم انہیں کی اس مخالفت کا نتیجہ ہے حالانکہ ان کے برادر بزرگ، ڈاکٹر خان صاحب کے بیان کے مطابق، یہ خود جانتے تھے کہ سرحد کا مسلمان پاکستان کا حامی ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ اُس زمانہ میں عبد الغفار خان صاحب دیانتدارانہ طور پر متحدہ قومیت کے حامی تھے اس لئے اُن کی اس زمانہ کی روش کو اب ان کے متعلق ... فیصلہ کا معیار نہیں بنانا چاہیئے۔ ہم بھی اس سے متفق ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے پاکستان بننے کے بعد پاکستان کو قلبی اور ذہنی طور پر اپنا لیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ پاکستان میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاشا نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ پاکستان ہندو کے لئے "روحانی" مسئلہ ہے۔ یعنی جب تک ہندو ہندو ہے وہ پاکستان کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ مسٹر سری پرکاشا نے جو بات ہندو کے متعلق کہی تھی، وہ بعینہٖ عبد الغفار خان صاحب پر صادق آتی ہے۔ جب تک پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا؟ ہندوستان کی سالمیت کے قائل تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد انہوں نے پختونستان کا شوشہ چھوڑ دیا تاکہ پاکستان کو کبھی استحکام نصیب نہ ہوسکے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ خان صاحب مذکور پاکستان میں پیدا ہوئے۔ پاکستان ان کا وطن ہے۔ پاکستان میں ان کی زمینیں ہیں۔ پاکستان میں ان کی جائیداد ہے۔ وہ پاکستان کے دشمن کیسے ہوسکتے ہیں؟ لیکن یہ دلیل اتنی کمزور ہے کہ اس کے خلاف کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خان صاحب خوب سمجھتے ہیں کہ اگر پاکستان ہندوستان میں شامل ہوجائے تو ان کی یہ زمینیں اور جائیدادیں کوئی نہیں چھین سکے گا اور صوبہ سرحد کی قیادت واحد ان کے حصہ میں آجائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں ہمارے نزدیک پاکستان کے ہندو اور سکھ باشندے خان صاحب سے کہیں زیادہ دیانتدار تھے۔ انہوں نے پاکستان کو دل سے نہیں اپنایا تو وہ پاکستان کو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔ لیکن خان صاحب کی یہ کیفیت ہے کہ وہ پاکستان کو ذہنی اور قلبی طور پر اپنا بھی نہیں سکے اور یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتے۔

خان عبد الغفار خان صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ جنرل اسکندر مرزا کا یہ کہنا غلط ہے کہ وہ (خان صاحب) اپنے پیرووں کو حکومت سے متصادم کرائیں گے۔ آپ نے کہا کہ یہ الزام اس لئے بے بنیاد ہے کہ سرخ پوش عدم تشدد پر کاربند ہیں اور محبت و اخوت کے قائل ہیں۔ ہم خان صاحب سے اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ اور ان کے سرخ پوش، مہاتما گاندھی اور ان کے اہنسا پر ایمان رکھنے والے متبعین سے بھی زیادہ عدم تشدد کے قائل اور اخوت و محبت کے علمبردار ہیں، اور کیا اس کے باوجود یہ حقیقت نہیں کہ مہاتما گاندھی نے اپنے پیرووں میں اور حکومت میں کس طرح تصادمات کرائے تھے۔ ہندوستانی سیاست میں فلسفۂ عدم تشدد کے جو مظاہرے دیکھنے میں آئے ہیں ان کے شاہد اب تک زندہ ہیں۔

اس کے بعد آپ ایک یونٹ کی طرف آتے ہیں۔ آپ ایک یونٹ کے خلاف ہیں لیکن آپ نے اپنے مسلک کی تائید میں آج تک دلیل کوئی نہیں دی۔ اس کے مقابلہ میں ان کی

تجویز یہ ہے کہ مغربی پاکستان کو نسلی بنیادوں پر تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور پھر ان تین حصوں کو ایک ذیلی وفاق (ZONAL FEDERATION) بنا دیا جائے۔

آپ سوچئے کہ جو شخص مسلمانوں کو نسلی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی تجویز پیش کر رہا ہے اس کا ذہن کس حد تک اسلامی ہے؟ نسلی تقسیم کا تصور اسلام کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایک یونٹ کے متعلق تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ اس کی بابت عوام سے استصواب کیا جائے لیکن اپنی تجویز کے متعلق یہ کہیں نہیں کہتے کہ اس کی بابت عوام سے پوچھ لیا جائے۔ یعنی جس تجویز کو خان صاحب پیش کریں اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ساری کی ساری قوم کے لئے قابل قبول ہے اور جس تجویز کے یہ مخالف ہوں اس کے متعلق تصور کر لیا جائے کہ قوم اس کے خلاف ہے۔ اس قسم کی منطق با تو 'بادش بخیر' گاندھی جی کے افق ذہنی سے جلوہ بار ہوا کرتی تھی اور یا اب ان کے برو ذ 'سرحدی گاندھی' کے محلہ دماغ سے باہر آتی ہے۔ قارئین کو یہ بھی یاد ہوگا کہ جب حکومت کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ خان صاحب پاکستان کے دیہات سدھار کے پروگرام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس طرح خدمت خلق کا کام کریں تو انہوں نے فرمایا کہ اگر حکومت ایک یونٹ کے منصوبے کو ترک کر دے تو میں ایسا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یعنی اگر خان صاحب کی رائے کے مطابق ایک یونٹ کی اسکیم کو ترک کر دیا ہو تو پھر عوام سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر ان کی رائے کے خلاف جانا ہو تو پھر استصواب عامہ کی ضرورت ہے۔ غور کیجئے کہ بعض لوگوں کو اپنے متعلق کتنے کتنے بڑے مغالطے ہوتے ہیں!

اس تقریر میں آپ نے بزعم خود دو "دلیلیں" وحدت مغرب کے خلاف دی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اس سے صوبائیت پھیل گئی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ جس تجویز پر عمل کرنے سے پہلے ہی صوبائیت کو اس قدر فروغ ہو جائے تو اس کو عمل میں لانے کے بعد کیا کچھ نہیں ہو جائے گا؟ یہ بھی گاندھوی منطق کا ایک نمونہ ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو مجال انکار نہیں کہ صوبائیت صوبائی حدبندیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی اس کا علاج حدبندیوں کو محو کر دینا ہے وحدت مغرب کا مقصود یہی ہے۔ لیکن اس تجویز کی مخالفت میں وہ طبقہ خصوصیت سے اٹھ کھڑا ہوا ہے جسے وحدت میں اپنا مستقبل نظر نہیں آتا۔ یہ صورت حال بالکل قابل فہم ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ صوبائیت کا یہ مظاہرہ وحدت کے تصور نے پیدا کیا خود دھوکہ کھانا نہیں تو دوسرے کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔

دوسری دلیل آپ کی یہ ہے کہ پٹھان قوم اسے پسند نہیں کرتی کہ وہ اپنے سے کم سیاسی شعور رکھنے والے علاقوں سے ملحق ہو جائے۔ پٹھانوں کو ایک قوم قرار دینا اسلام کے نظریۂ اجتماع سے ہی متصادم نہیں ہوتا بلکہ پاکستان کے اساسی تقاضائے وحدت و سالمیت کے بھی بالکل منافی ہے۔ یہ خیال اسی مذموم ذہنیت کا پروردہ ہے جسے مٹانے کے لئے مغربی پاکستان کو ایک صوبہ بنایا جا رہا ہے۔ لیکن خان عبدالغفار خان صاحب اسے وحدت کے خلاف بطور دلیل پیش کر رہے ہیں اور اس طرح علت کو نتیجہ کہہ کر افسوسناک خلط مبحث پیدا کر رہے ہیں۔

یہ تو رہا خان عبدالغفار خان کا معاملہ۔ اب ذرا ان کے بارے میں حکومت کے رویہ کو دیکھئے۔ جن افسوسناک حالات میں ان کے داخلۂ سرحد سے پابندی ہٹائی گئی اس پر طلوع اسلام میں اس سے پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس غلط بخشی کی توجیہ ۲۰ر جولائی کو جنرل اسکندر مرزا نے یہ کی کہ حکومت عبدالغفار خان صاحب کو دنیا کے سامنے اپنے آپ کو پاکستانی ثابت کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ ہم حیران ہیں کہ حکومت نے یہ "بخشنے بخشوانے" کا ٹھیکہ آخر کیوں لے لیا ہے؟ ابھی کل ہی ہمارے وزیر اعظم صاحب بنگال میں اس شخص کو ملک میں ایک بہت بڑی پوزیشن عطا فرما چکے ہیں جنہیں خود ہی "غدار" قرار دیا تھا۔ آج وزیر داخلہ کم و بیش وہی کھیل کھیل رہے ہیں۔ قوم جاننا چاہتی ہے کہ آخر یہ کون لوگ ہیں جن کی اس قدر خوشامد کی جا رہی ہے؟ ہم حکومت سے پوچھتے ہیں کہ عبدالغفار خان کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ قانون سے باہر ہیں؟ کیا کسی وزیر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی شخص کی سرگرمیوں کو ملک اور حکومت کے مفاد کے منافی سمجھے تو وہ یہ تجربہ کرنا پھر ... کہ اسے پاکستانی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے؟

چلئے، اسے بھی جانے دیجئے۔ ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ حکومت نے عبدالغفار خان صاحب کو ایسا موقع دے کر اتمام حجت کر لیا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ خود جنرل اسکندر مرزا فرماتے ہیں:

> حکومت کی توقعات ابھی تک غلط نکلی ہیں.....
> میں نے خان عبدالغفار خان سے ایک یونٹ کے سلسلہ میں گفتگو کی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ خود غرضی اور شدید صوبائیت کا شکار ہیں اور انہیں اپنے ہمسایوں سے نفرت ہے۔ ان حالات میں ان سے کوئی معقول بات نہیں کی جا سکتی۔
> ..... وہ انتہائی کوشش کریں گے کہ اپنے سرخپوشوں اور حکومت میں تصادم کی صورت پیدا کریں۔ کیونکہ وہ سرے سے ملک کے موجودہ آئینی نظم و نسق ہی کے خلاف ہیں۔ جو تحریک حکومت کے خلاف ہو وہ آخر کار عوام ہی کے خلاف ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی حکومت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ وزیر داخلہ نے یہ دیکھ لیا ہے کہ انہوں نے عبدالغفار خان صاحب کو جو موقع دیا تھا اس کا انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ وہ اپنی جماعت کو حکومت سے تصادم کرانے پر تلے ہوئے ہیں، اور اسے حکومت برداشت نہیں کرے گی۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان پر سے پابندی ایسے وقت اٹھائی گئی تھی جب اُن کی سرگرمیوں کے پیش نظر ان کی گرفتاری تک کی افواہ مشہور ہو چکی تھی۔ اس مقام پر ہم اس کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ زید، بکر یا عمر کو کسی خاص علاقہ میں جانے دیا جاتا ہے یا نہیں۔ یا انہیں کھلے بندوں پھرنے کی اجازت ملی رہتی ہے یا نہیں۔ ہمارے نزدیک شخصیتوں کا سوال ہی نہیں۔ لیکن ہم حکومت سے یہ پوچھتے ہیں کہ

(۱) خان عبدالغفار خان کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ سوچ سمجھ کر کہا گیا ہے اور آیا وہ صحیح ہے؟

(۲) اگر یہ سب کچھ یونہی زیب داستان کے لئے کہہ دیا گیا ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟

(۳) لیکن یہ حقیقت پر مبنی ہے تو حکومت ملک کو اس فتنے سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا کر رہی ہے کیا حکومت اس وقت تک چپکے بیٹھے تماشہ دیکھتی رہے گی جب تک کوئی تصادم رونما نہیں ہو جاتا؟

لیکن بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ سرحد کے جو حالات ہمارے سامنے ہیں ان کی روشنی میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ خان عبدالغفار خان اپنی اس مہم میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لئے نہیں کہ ان کا وہاں اثر اتنا ہے کہ کوئی دوسرا ان کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکے گا۔ نہ ہی اس لئے کہ سرحد کے باشندے فی الواقعہ ایک یونٹ کے خلاف ہیں۔ یا خان صاحب اپنے مسلک کی تائید میں ایسے قوی دلائل رکھتے ہیں جن کا جواب نہیں بن پڑ سکتا۔ بلکہ اس لئے کہ مسلم لیگی حکومت نے گذشتہ آٹھ سال میں جو کچھ سرحد میں کیا ہے (اور کہاں اب نہیں کیا) اس کی وجہ سے لوگ موجودہ نظم و نسق سے اس قدر نالاں ہیں کہ وہ ہر اس شخص کا ساتھ دیں گے جو مسلم لیگی حکومت کی مخالفت کرے گا۔ سرحد میں سرخپوشوں کی تحریک کی کامیابی کا راز بھی یہی تھا کہ اُس زمانے میں لوگ انگریزی حکومت کی سختیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ عبدالغفار خان صاحب نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے بھانپ لیا ہے کہ بعینہٖ اُسی قسم کا موقعہ اب پھر آ گیا ہے۔ اس لئے وہ اس موقع سے بھی فائدہ اٹھا لیں گے۔ لہٰذا ان کی کامیابی، ان کے حسن تدبر یا برسر حق ہونے کا نتیجہ نہیں ہوگی۔ بلکہ نتیجہ ہوگی مسلم لیگی حکومت کے سیاہ نامۂ اعمال کا۔ بعینہٖ اُس طرح جس طرح بنگال میں فضل الحق صاحب کی کامیابی، مسلم لیگی حکومت کی نالائقیوں اور بدعنوانیوں کا فطری نتیجہ تھی۔

لہٰذا اگر ہمارے ارباب حل و عقد چاہتے ہیں کہ سرحد بھی اسی طرح ہاتھ سے نہ نکل جائے جس طرح بنگال ہاتھ سے نکل چکا ہے (اور یاد رہے کہ سرحد کے ہاتھ سے نکل جانے کے نتائج کہیں زیادہ دور رس اور تباہی خیز ہوں گے) تو اس کا علاج نہ وزارت بدلنے میں ہے نہ خان عبدالغفار خان کو اس کا ذمہ دار ٹھیرانے میں۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ وہاں نظم و نسق کی بدعنوانیوں سے جو ابتری پھیل رہی ہے اسے فوراً دور کیا جائے۔ وہاں کے حالات یہ ہیں کہ لوگ اپنی بنیادی ضروریات زندگی تک کے لئے محتاج ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے بچوں کو ٹھکانے سے روٹی کپڑا نصیب ہے نہ ان کے جانوروں کو چارہ۔ تمام بڑے بڑے گاؤں میں غنڈہ گردی ہو رہی ہے جو خود پولیس (اور بعض اوقات

وہاں کے اسمبلی کے ممبروں کے اشارے پر لوٹ مچا رہے اور شریفوں پر گوشۂ عافیت تنگ کر رہے ہیں۔ معاشرے سے امن اور اطمینان دونوں مفقود ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ صوبہ میں امن اور اطمینان قائم کیا جائے اور لوگوں کی، ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری حکومت اپنے سر پہ لے۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا موثر حربہ جو عبدالغفار خان وشرکاء کی تخریبی کوششوں کا صحیح معنوں میں توڑ ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ، صوبہ سرحد میں وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنے اخلاص و دیانت اور جوشش کردار سے نہ صرف پاکستان کو قائم کیا بلکہ خان عبدالغفار خان کی تحریک کو کھلے بندوں شکست دینے کا موجب ہوئے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد انہیں اس طرح سے کچلا گیا کہ وہ دل برداشتہ ہو کر صوبہ کے عملی معاملات میں حصہ لینے سے یکسر کنارہ کش ہو گئے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اب بھی عوام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں اور جو پاکستان کے خلاف ہر تخریبی قوت کا منہ توڑ جواب بن سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ زمامِ کار پھر سے ان مخلص مجاہدین کے ہاتھ میں دی جائے۔ واضح رہے کہ یہ لوگ دولت واقتدار کے خواہاں نہیں نہ کسی عہدہ اور منصب کے۔ لیکن یہ تو ضرور ہے کہ ان کے راستے میں جو کانٹے خود "انہوں" نے بکھیر رکھے ہیں انہیں صاف کر دیا جائے۔ ایسا ہو جائے تو دیکھئے کہ وہ ان تخریبی عناصر کی شرانگیزیوں کی مدافعت میں کیا کچھ کر دکھاتے ہیں۔

لیکن اگر ہمارے اربابِ بست وکشاد نے یہ کیا نہ وہ، تو پھر ہمیں اس دن کا انتظار کرنا چاہیئے جب صوبہ سرحد ہم سے کٹ کر افغانستان کے ساتھ جا ملے۔ اس لئے کہ پختونستان کے نعرہ اور ایک یونٹ کی مخالفت کے پیچھے یہی جذبہ کام کر رہا ہے اور یہ ڈور دلی اور کابل دونوں مرکزوں سے ہلائی جا رہی ہے اس کے لئے خان عبدالغفار خان کو "فخرِ ایشیا" بننے کے خواب دکھائے جا رہے ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ انہیں پشاور میں جو سب سے پہلا سپاسنامہ پیش کیا گیا ہے اس میں انہیں اسی لقب سے مخاطب کیا گیا ہے۔

خدا کرے کہ ملک کا ہوشمند طبقہ اس خطرہ کو صحیح طور پر محسوس کرے۔

مظلوم کشمیر

گزشتہ اشاعت میں ہم نے کشمیر کی تازہ صورت حال کا اجمالی جائزہ لے کر حکومت پاکستان پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ ایک تو ہندوستان اندر اندر کشمیر کو پوری طرح اپنے آپ میں مدغم کر رہا ہے۔ دوسرے اس نے علانیہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ استصواب بیکار ہے کیونکہ ریاست نے ہندوستان سے الحاق کر رکھا ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں اگر حالات کا یہ تجزیہ ٹھیک تھا۔ اور آج پاکستان میں کون اہلِ نظر ہے جو اسے غلط کہے گا؟ تو اس سے ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا اور وہ یہ کہ کشمیر کے تصفیہ کے بارے میں اربابِ حکومت نے پنڈت نہرو اور ان کی حکومت سے جو حسن ظن قائم کیا ہوا ہے وہ غلط ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کوئی اور طریق کار اختیار کرنا چاہیئے۔ ہماری اس تحریر کی روشنائی بھی ہنوز خشک نہ ہونے پائی تھی کہ وزیر اعظم صاحب کی تازہ ماہانہ نشری تقریر سامنے آ گئی۔ اس میں آپ نے کشمیر کے متعلق جس روش کا اظہار کیا ہم اس کا ماتم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ نے پنڈت پنت کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ پنڈت نہرو نے انہیں یقین دلایا ہے کہ ہندوستان بین الاقوامی معاہدات کا پابند رہے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پنڈت نہرو نے وزیر اعظم صاحب کو ایسا یقین دلایا ہوگا۔ انھوں نے کب ایسا یقین نہیں دلایا تھا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے آج تک اس کا کیا ثبوت دیا ہے کہ وہ بین الاقوامی معاہدات پر عمل درآمد بھی کریں گے؟ اگر ہم سات سال کے تلخ تجربے کو ایک لمحے کے لئے بھول بھی جائیں (جو بجائے خود ایک ناممکن سی بات ہے)، تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پنڈت پنت جو پنڈت نہرو کے ضمیر بردار ہیں کیوں ایسی غیر ذمہ دار بات کہہ گئے؟ کیا ان کے بظاہر غیر ذمہ دارانہ بیان پر پنڈت نہرو نے صاد نہیں کیا؟ ہمیں معلوم نہیں کہ پنڈت جی نے محمد علی صاحب کو کیا یقین دلایا ہے۔ لیکن انھوں نے دہلی کے پبلک جلسے میں آپ کو جو جواب دیا تھا۔ اس میں تو اس نتیجہ تک پہنچنے کی ذرہ بھر گنجائش نہ تھی کہ پنڈت نہرو نے پنڈت پنت کے بیان سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اگر پنڈت جی نے وزیر اعظم صاحب کو اس تقریر سے مختلف جواب دیا ہے تو ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اسے پبلک کی اطلاع کے لئے شائع کیا جائے تاکہ ملک کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کشمیر کا معاملہ جس انتہائی نازک مرحلہ میں ہے اس میں اس قسم کی رازداری کشمیر اور پاکستان دونوں کے مفاد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ وزیر اعظم نے اس سلسلہ میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کی ہے۔ یہ تجویز اپنی جگہ درست لیکن ضرورت ملک کو اعتماد میں لینے کی ہے اور اس سے وزیر اعظم صاحب کو گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کا اعتماد پہلے ہی ملک میں بہت کم ہو چکا ہے۔ اب رہا سہا ان باتوں سے ختم ہو جائے گا۔

مہاجر بستیاں

حکومت بے گھروں کو آباد کرنے کے لئے کراچی کے گرد و نواح میں جو مہاجر بستیاں بسا چکی ہے یا بسا رہی ہے۔ ان پر اصولی اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں باشندوں کو شہر سے اٹھا کر میلوں دور آباد کر دیا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ انہیں کسبِ معاش کے لئے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑے گی۔ ان لوگوں کو کام کاج کے لئے بالعموم شہر آنا پڑتا ہے جس سے ہر روز ان کی آمدنی کا خاصا حصہ آمد و رفت کے کرایوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس سے آبادکاری کا حقیقی مقصد بہت حد تک فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن ان بے گھروں کو گھر کی خاطر اور بھی بہت سے مصائب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ نئی بستیوں میں پولیس کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہوتا جس سے وہاں کے رہنے والوں کے جان و مال خطرے میں رہتے ہیں۔ ان کے لئے طبی امداد کی کوئی صورت نہیں ہوتی تو کافی تعداد میں کئی ڈسپنسریاں موجود ہوتی ہیں۔ ان کے بچوں کے لئے تعلیم کی کوئی آسانی نہیں مہیا کی جاتی۔ جو مشترکہ محدود بیت الخلاء بنائے جاتے ہیں ان کی صفائی کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہوتا۔ یہ چند موٹی موٹی شکایات ہیں جو ہر مہاجر بستی میں آباد ہونے والوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ لیکن نہ ان کی کوئی پیش بندی کی جاتی ہے نہ ان کا ازالہ کرنے کی کوئی قابلِ ذکر کوشش ہوتی ہے۔

ابتداءً تو شاید یہ کہا جا سکتا ہو کہ ناتجربہ کاری کی بنا پر ان مشکلات کا سدباب نہ ہو سکا۔ لیکن اب جب متعدد نواحی بستیاں بسائی جا چکی ہیں اور تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر بستی میں باشندوں کو کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ اس کے لئے کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی کہ ہر نئی بستی میں یہی صورت حال درپیش آئے۔ لیکن ہمارے بحالیات کے خداوند ہر بار وہی بے ڈھب بات کرتے ہیں جو اس سے پہلے وہ کر چکے ہوتے ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال لانڈھی مہاجر بستی ہے۔ وہاں ۴۰ ایکڑ زمین پر بارہ ہزار قطعات رہائشی مکانات کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی چھ ہزار کوارٹر حکومت کی طرف سے تعمیر ہوں گے۔ اور ان کی لاگت فی کوارٹر ۵۰۰، روپے ہوگی اب تک جن بے گھروں کو وہاں پہنچایا گیا ہے۔ انھیں وہ ساری مشکلات درپیش ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے لیکن یہاں ایک اور عنصر کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ جس سے لانڈھی بستی سب بستیوں پر سبقت لے گئی ہے پچھلے ہفتہ وزیر مہاجرین اپنی کارگذاری دکھلانے کے لئے چند اخباری نمائندوں کو وہاں لے گئے وہاں معاصر "ٹائمز آف کراچی" کی اطلاع کے مطابق انھیں

> ایک نمونے کا کوارٹر دکھایا گیا جسے دیکھ کر سب نے پسند کیا۔ اس میں ایک کمرہ۔ باورچی خانہ، غسل خانہ، پاخانہ، صحن سب ضروریات موجود تھیں اخباری نمائندے اس حسن انتظام کی تعریف میں رطب اللسان تھے کہ ایک مہاجر نے چیخنا شروع کر دیا کہ "آپ یہ نہ سمجھئے کہ ہم اس قسم کے کوارٹروں میں رہتے ہیں"۔ اس پر ڈپٹی ریفیوجی کمشنر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہ وقت ایسی شکایات کا نہیں۔ اس پر اخباری نمائندوں نے اصلی کوارٹر دیکھنے پر اصرار کیا۔۔۔۔ ان کوارٹروں میں صرف ایک باہر کا دروازہ تھا۔ ورنہ باورچی خانے، غسل خانے، پاخانے وغیرہ میں کہیں کواڑ نہیں تھے۔ پردے کی دیوار چار پانچ موٹی اور چھ فٹ اونچی تھی اور وہ ہلتی تھی۔ مہاجرین نے شکایت کی کہ یہ دیواریں ان کی حفاظت کے لئے کافی نہیں اور چوری چکاری ہوتی رہتی ہے۔

اسی قسم کی اطلاعات دیگر اخباری نمائندوں نے بھی اپنے اخبارات میں شائع کیں۔ اور حکومت نے ان کی تردید نہیں

کی۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ ہوا یا نہیں ہوا وہ غلطی یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ عمداً تھا۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ متعلقہ عملے نے مہاجرین کو ہی نہیں بلکہ حکومت کو بھی سخت دھوکہ دیا ہے۔ ہم ان اخباری نمائندوں کو مبارکباد دیتے ہیں جنھوں نے اس ڈھونگ کی قلعی کھولی اور ہمیں خوشی ہے کہ حکومت نے اس کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی بھی مقرر کردی ہے۔ خدا کرے کہ یہ کمیٹی ان خطرات کا انداز کرسکے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو یہی داستان ہر جگہ دہرائی جاتی رہے گی۔ ہم اس سلسلہ میں حکومت سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جن قومی مجرموں نے یہ دھوکہ دیا ہے انھیں قرار واقعی سزا دینی چاہیئے۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور آئندہ کے لئے ان کا سدباب ہوسکے۔

انڈیا آفس لائبریری

مئی کے تیسرے ہفتے میں پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے تعلیم کی ملاقوں کے بعد مشترکہ اعلامیہ میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا آفس لائبریری دونوں ممالک کی ملکیت ہے وہی اس کے مستقبل کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ نیز اس میں یہ اشارہ موجود تھا کہ دونوں ممالک میں بعض امور سے متعلق سمجھوتہ ہوگیا ہے۔ اس کے بعد مئی کے آخر میں مولنا ابوالکلام آزاد نے کراچی میں یہ کہا کہ دونوں ممالک نے تقسیم کا اصول تسلیم کرلیا ہے۔ اب وہ اس سلسلہ میں برطانوی نمائندوں سے ملاقات کرنے کے بعد دہلی پہنچے ہیں تو انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ پاکستان کے وزیراعظم اور وزیر تعلیم مئی میں دہلی آئے تھے تو انھوں نے زبانی زبانی یہ مان لیا تھا کہ انڈیا آفس لائبریری دہلی منتقل کرلی جائے اور مطبوعہ کتابوں کے مثنی اور مسودات کا ساٹھ ستر فی صدی حصہ پاکستان کو دے دیا جائے۔

ہم نے ۶ جون کے طلوع اسلام میں لکھا تھا کہ انڈیا آفس لائبریری کا معاملہ بڑا اہم ہے اور اس سلسلہ میں ذرا بھی تغافل شعاری سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ ہم نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ قوم کو صاف صاف بتا دیجئے کہ دہلی میں کیا طے ہوا تاکہ بعد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے حکومت نے اس قسم کی کوئی وضاحت نہیں کی اور نہ مولنا آزاد کے بیان کی تردید کی۔ لیکن اب ایک سرکاری ترجمان نے یہ بتایا ہے کہ ہمارے وزیراعظم یا وزیر تعلیم میں سے کسی نے بھی کوئی معاہدہ نہ زبانی یا تحریری اس مطلب کا نہیں کیا تھا۔ یعنی نہ تو وہ اس پر رضامند ہوئے تھے کہ لائبریری لندن سے دہلی منتقل ہوجائے اور نہ اس پر کہ کتابوں کی تقسیم کیسے ہو۔ ہم حیران ہیں کہ حکومت نے اس قسم کی وضاحت مئی میں ہی کیوں نہ کردی جب دہلی سے علانیہ یہ کہا جارہا تھا کہ اس قسم کا سمجھوتہ ہوگیا ہے؟ یہ بھی کم حیران کن۔ اور افسوس ناک نہیں کہ اب تردید ضروری سمجھی گئی ہے تو اس کے لئے ایک گمنام ترجمان کا ذریعہ اختیار کیا گیا۔ حالانکہ مناسب سطح پر سے صاف طور پر اس کا اظہار کیا جاسکتا تھا۔ غور کیجئے ہماری کتنی قومی مشکلات محض اس وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں کہ ہمارے یہ ذمہ دار حضرات معاملات طے کرتے وقت باہمی فیصلوں کو واضح تحریروں میں منضبط نہیں کرتے اور بہت کچھ محض زبانی باتوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔

بہرحال یہ غنیمت ہے کہ صورت حال زیادہ بگڑی نہیں اور حکومت پاکستان نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ اب آئندہ کیلئے ضروری ہے کہ پوری احتیاط سے کام لیا جائے اور لائبریری کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ پاکستان میں کوئی قابل ذکر لائبریری موجود نہیں تقسیم کے وقت غیر منقسم ہندوستان کی جن لائبریریوں سے پاکستان کو بہ حیثیت ایک مالک کے حصہ ملنا چاہیئے تھا وہ نہیں ملا۔ یہ صریح ناانصافی ہے۔ اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ ہم انڈیا آفس لائبریری سے محروم نہ ہوں۔ پاکستان یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ اس لائبریری کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اگر ہندوستان اس میں سے حصہ لینا ہی چاہتا ہے تو اسے ہمیں بھی غیر منقسم ہندوستان کی تمام لائبریریوں کا حصہ دینا چاہئے۔ ورنہ یہ ہونا چاہیئے کہ لائبریری پاکستان میں منتقل ہوجائے اور ہندوستان کو اسے استعمال کرنے کی پوری پوری آسانیاں حاصل ہوں۔ ہمیں توقع ہے کہ حکومت پاکستان یہی موقف اپنائے گی اور اسی پر شدت سے قائم رہیگی۔

عید اور پانی

تدبیر امور میں بدنظمی کے مظاہرے تو آئے روز ہر شعبے میں ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے نظرانداز یا معاف کیا جائے۔ لیکن کراچی میں عید کے دن پانی کی تقسیم کے سلسلہ میں جو مذاق روا رکھا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور از حد ناقابل برداشت۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عید کے دن کئی علاقوں میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں آتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ عید کی صبح کو اچانک تمام نلکے خشک ہوجاتے ہیں اور سارا دن یا دن کا بیشتر حصہ خشک رہتے ہیں۔ جن بیچاروں کو عید کے دن صفائی کے لئے تو کیا پینے تک کے لئے پانی نہیں ملتا ان کے متعلق اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ خداوندان آب کو کیا کیا دعائیں دیتے ہوں گے

واضح رہے کہ پانی کی یک لخت بندش کسی خرابی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ عملہ کی تغافل شعاری اور سنگدلی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بعض علاقوں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ تحقیق حال کے بعد پتہ چلا کہ پانی کھولنے والے صاحب خود عید کی تیاریوں میں مصروف تھے اور انھیں اس کی فرصت ہی نہیں تھی کہ اپنے علاقے میں پانی چھوڑتے۔ چنانچہ وہ جب عید مناکر فارغ ہوگئے تو انھوں نے پانی کھولا اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ اب کے بھی عید پر یہی کچھ ہوا۔ ہمیں کئی علاقوں سے پانی بند رہنے کی شکایات موصول ہوئی ہیں بعض علاقوں میں تو عید کو اور عید سے پہلے ایک دن یعنی پورے دو دن پانی بند رہا اور حد یہ ہے کہ نہ اس کا اعلان کیا جاتا ہے کہ کس وجہ سے پانی بند رہے گا اور نہ اس کے بعد ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو متعلقہ عملہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا فریضہ منصبی اپنے علاقے میں پانی مہیا کرنا ہے اور نہ حکام بالا باز پرس یا اصلاح احوال کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

ہم حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کم از کم تہواروں کے موقع پر اتنی پیش بندی کرلیا کرے کہ پانی کی بہم رسانی کا سلسلہ چلتے چلتے بلاوجہ رک نہ جایا کرے۔ پانی کے اوقات عید کی ضروریات کے مطابق بدلے جاسکتے ہیں لیکن پانی بند رکھنے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہوسکتی۔

دستور پاکستان

قرآن نظام معاشرت کا جو نقشہ پیش کرتا ہے اس کی رو سے

(۱) تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری حکومت کے سر ہوتی ہے

(۲) وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ وہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہتے ہیں۔ تاکہ مملکت ربوبیت عامہ کی کفیل ہوسکے۔

طلوع اسلام میں اس نظام کی تفصیل اور تشکیل سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس پر خصوصیت سے کتاب

"نظام ربوبیت"

میں بحث کی گئی ہے۔

اگر آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ پاکستان میں ایسا ہی نظام رائج ہونا چاہیئے تو آپ مجلس دستور ساز سے مطالبہ کیجئے کہ آپ یہی اور صرف یہی نظام چاہتے ہیں۔

طلوع اسلام کثیر تعداد میں شائع ہو کر پاکستان و ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقے کے لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گذرتے ہیں۔

نرخنامہ اشتہارات، و تفصیلات ناظم ادارہ (شعبۂ اشتہارات) سے حاصل کیجئے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

طلوع اسلام کی قیمت

اس اشاعت سے چار آنے کی بجائے چھ آنے کردی گئی ہے۔ قارئین اور ایجنٹ حضرات مطلع رہیں۔

ناظم

تاریخی شواہد

(۲۶)

کرنے کو ان لوگوں نے معاہدہ کر لیا تھا۔ لیکن سرمایہ پرستی، اور اقتدار خواہی کی لذت اتنی آسانی سے چھوٹا نہیں کرتی۔ اس لئے انھوں نے اپنے قول و قرار کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ○ (۷/۷۷)

غرضیکہ انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا۔ اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انھوں نے کہا: اے صالح اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔

اونٹنی کو کسی نے یونہی اتفاقیہ زخمی نہیں کیا۔ بلکہ ان سرکشی کرنے والوں نے خاص اہتمام سے اپنے سرغنہ کو بلایا۔ اور اس نے بھرپور ہاتھ سے اسے ہلاک کیا۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ○ (۵۴/۲۹)

چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھی کو پکارا (بلایا) پس اس نے (اونٹنی پر ایک بھرپور) وار کیا اور ہلاک کر ڈالا!

ہلاک کرنے کو تو کر گئے۔ لیکن جب اس کا احساس بیدار ہوا کہ ہم نے کس قدر پختہ عہد کیا تھا اور اب اس سے کس طرح بیدردی سے پھر گئے ہیں تو۔ دل میں ارتعاش پیدا ہوا۔

فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ۙ (۲۶/۱۵۷)

غرضیکہ انھوں نے اس (اونٹنی) کو ہلاک کر ڈالا (مگر پھر بعد میں) نادم ہوئے (مگر یہ ندامت کچھ کام نہ آسکی)

اب اتمام حجت ہو چکی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ۔

فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ○ (۱۱/۶۵)

صالح نے کہا: (اب تمھیں صرف) تین دن (کی مہلت ہے) اپنے گھروں میں کھا پی لو۔ یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ نکلے گا!

غور کیجئے۔ انھیں تین دن پہلے بتا دیا جاتا ہے کہ اب تمہاری تباہی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ ان کی ہر بات کو جھٹلاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس وعید کا بھی مذاق اڑایا۔ اور آنے والی تباہی کی کوئی پروا نہ کی۔

اس کے بعد وہ کچھ ہوا جس کے تصور سے آج بھی ہر قلب سلیم سینے میں دھڑکنے لگ جائے۔ اور ہر دیدۂ عبرت چشم حیراں بن جائے۔ ان آگ سے بھرے ہوئے (آتش فشاں) پہاڑوں میں ایک دھماکہ ہوا جس سے ایک چیخ، ایک گرج۔ ایک کڑک کی آواز فضا میں گونجی اور قوم ثمود کی بستیاں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ (۷/۷۸)

پھر ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انھیں آ لیا۔ اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے!

یہاں اس عذاب کو ایک لرزہ انگیز دہشت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ اسے زور کی کڑک سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۙ كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا إِنَّ ثَمُودَ كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِثَمُودَ ○ (۱۱/۶۷-۶۸)

اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کا حال یہ ہوا کہ ایک زور کی کڑک نے آ لیا جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ (وہ اس طرح اچانک مر گئے) گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کے قانون سے انکار کیا۔ اور ہاں سن رکھو کہ ثمود کے لئے محرومی ہوئی!

اسی کا تذکرہ سورۃ الحجر میں ہے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ○ فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○ (۱۵/۸۳-۸۴)

صبح کو اٹھے تو ایک ہولناک آواز نے انھیں آ پکڑا اور جو کچھ انھوں نے اپنی سعی و کاوش سے کمایا تھا، وہ کچھ ان کے کسی کام نہ آیا۔

ایک اور مقام پر اسے بجلی کی کڑک کہا گیا ہے۔

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَى عَلَى الْهُدَى فَأَخَذَتْهُمْ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○ (۴۱/۱۷)

اور دیکھو، قوم ثمود کو ہم نے سیدھی (نجات و کامیابی کی) راہ دکھا دی تھی مگر انھوں نے راہ یابی پر اندھے پن کو ترجیح دی۔ بالآخر ذلت (اور رسوائی) کے عذاب کی ایک کڑک نے انھیں آ پکڑا۔ اور یہ سب کچھ اس (انکار و بدعملی) کی وجہ سے ہوا جو وہ کرتے رہتے تھے۔

اور ان کا انجام!

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ○ (۵۴/۳۱)

ہم نے اُن پر ایک چیخ بھیجدی اور وہ ایک باڑ لگانے والے کی سوکھی ٹہنیوں کے چورے کی طرح (ٹوٹ کر اور فنا) ہو کر رہ گئے!

قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف ایک خفیہ تدبیر کی تھی۔ وہ تو ناکام و نامراد رہی۔ اور قانون مکافات کی وہ خفیہ تدبیر جو یوں ان کے پاؤں کے نیچے پختگی کو پہنچ رہی تھی اس طرح ابھری کہ کوئی ابھرنے والا سامنے نہ رہا۔

وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ○ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○ (۲۷/۵۰-۵۲)

اور (دیکھو) ایک خفیہ تدبیر انھوں نے کی تھی اور ایک خفیہ تدبیر ہم نے کی۔ اور انھیں اس کا کوئی احساس و شعور تک نہ تھا۔ پس ذرا غور تو کرو کہ ان کی خفیہ تدبیر کا انجام کیسا رہا (یہی رہا!) کہ ہم نے انھیں اور اُن کی (پوری) قوم کو۔ سب کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ چنانچہ (آج) ان کے مکانات خود ان کے ظلم (انکار و بدعملی) کی وجہ سے (بالکل) ویران پڑے ہوئے ہیں۔ ان واقعات میں بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہوں۔ (عبرت و موعظت کی بڑی) نشانی ہے۔

وہ اس ہلاکت و تباہی کے خوفناک طوفانِ آتشیں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اتنے عاجز و بے بس تھے کہ اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہ کر سکے اور اس آفت جہاں سوز سے راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔

نوجوانوں کے لئے فکر و نظر کی نئی راہیں:
سلیم کے نام
از: پرویز
قیمت: چھ روپے

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص و امتیازات اور زمانۂ جاہلیت کی حیات عقلیہ کی کیفیت بیان ہوچکی ہے۔ عربوں کی حیات عقلیہ کے مظاہر میں سے لغت اور زبان کا بیان ہو رہا تھا۔ آج کی فرصت میں عربوں کی شعر و شاعری سے گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کہنا تو صحیح ہے کہ حکام اور شعراء یقیناً عوام الناس سے عقلی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہوتے تھے۔ لیکن شعراء ان حکام سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہوتے تھے۔ متنازعہ فیہ مسائل کے فیصلے یہ حکام ہی کیا کرتے تھے۔

ہر قبیلہ میں ایک یا ایک سے زیادہ حاکم ہوا کرتے تھے ان میں سے بہت سے لوگ مشہور ہیں مثلاً اکثم بن صیفی، حاجب ابن زرارہ، اقرع ابن حابس اور عامر ابن الظرب وغیرہ۔ لٹریری کتابوں میں ان کے جو اقوال و احکام نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعراء کی بہ نسبت عقلیت میں زیادہ ترقی یافتہ اور رائے میں زیادہ صادق اور سچے ہوتے تھے۔ اگرچہ شعراء ان کے مقابلہ میں زیادہ وسیع الخیال ہوتے تھے۔ اور بات کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کی زیادہ قدرت رکھتے تھے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ عام طبقات کی بہ نسبت شعراء عقلی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ جس کی دلیل خود ان کے اشعار میں یا وہ باتیں ہیں جو کتب ادب میں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ عقلی ترقی کی جہت سے اپنی طرف سے کافی اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ طفیل دوسی (قبیلۂ دوس کا مشہور شاعر) کو معظمہ میں آیا تو قریش کے لوگوں نے اسے ڈرایا کہ رسول اللہ صلعم کے پاس نہ جائے اور ان کی باتیں نہ سنے کہیں وہ ان سے متاثر نہ ہو جائے۔ طفیل کا بیان ہے کہ لوگ اسے برابر سمجھاتے رہے حتیٰ کہ میں نے طے کر ہی لیا کہ میں رسول اللہ صلعم کی کوئی بات سنوں گا ہی نہیں۔ لیکن پھر میں نے اپنے دل میں سوچا "میری ماں مجھے روئے۔ میں ایک ذہین اور ہوشیار آدمی ہوں شاعر ہوں۔ حسن و قبح میں فرق کرنے کی تمیز رکھتا ہوں۔ مجھے اس شخص کی باتیں سن لینے سے کون چیز مانع ہوسکتی ہے آخر وہ کیا کہتا ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اگر وہ اچھی بات ہوگی تو میں اسے قبول کرلوں گا۔ اور اگر بری بات ہوگی تو میں اسے نہیں مانوں گا"۔ اس پر اتنا اضافہ اور کرلیجئے کہ زمانہ جاہلیت کے اکثر شعراء کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنی قوم میں نہایت معزز اور ممتاز ہوتے تھے۔ کیونکہ ان شعراء کا مقام ان کے قبیلہ میں اپنے قبیلہ کے مناقب و فضائل کے گن گانے، ان کے مُردوں کا مرثیہ کہنے، ان کے دشمنوں کی ہجو کہنے کا مقام ہوتا تھا۔ ابتداء عہد میں عربوں میں بہت کم کوئی نقیر آدمی ملے گا۔ جس نے شعر و شاعری کو اپنا پیشہ بنالیا ہو۔ جیسا کہ بعد میں حطیئہ شاعر نے کیا۔

بہرحال ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عرب میں شعراء عقلی اعتبار سے ان کے عام طبقات سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے تھے لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے تھے۔

حیاتِ عقلیہ پر شعر کی رہنمائی

قدیم زمانہ سے لوگ کہتے آئے ہیں کہ شعر عرب کا دیوان اور دفتر ہے؛ جس سے ان کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا دفتر ہے۔ جس میں ان کے اخلاق، عادات، دیانت اور عقلیت تمام چیزیں مکمل طور پر پیش کی گئی ہیں بالفاظ دیگر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے اشعار میں اپنے آپ کو صحیح طور پر پیش کردیا ہے۔ پرانے زمانہ کے ادیب عرب کے جاہلی اشعار سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں چنانچہ انھوں نے ان کے بعض مشہور جنگوں کے حالات کا انہی اشعار سے پتہ لگایا ہے۔ انہی اشعار سے انھوں نے عربوں کے ان اخلاق و عادات کو معلوم کیا ہے۔ جنھیں قابل مدح یا لائق مذمت سمجھتے تھے۔ انہی اشعار سے انھوں نے جزیرۂ عرب اور جزیرۂ عرب میں جو جو شہر، پہاڑ، ٹیلے، زم اور نشیبی زمینیں وادیاں، پودے اور جانور ہوتے تھے ان کا پتہ لگایا ہے نیز جنات، اصنام اور خرافات کے بارے میں ان کے کیا کیا عقائد تھے یہ تمام باتیں جاہلیت کے اشعار ہی سے معلوم کی گئی ہیں۔ ان حضرات نے ان تمام موضوعات پر ضخیم ضخیم کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں۔

اس دفتر سے نفع اندوزی کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ علماء ان تمام جاہلی اشعار کی طرف توجہ کرتے جو ان کے نزدیک صحیح ثابت ہوتے۔ انھیں سند اور متن دونوں کی تنقید کرنی چاہیئے تھی ان تمام اشعار سے دور رہنا چاہیئے تھا جو صحیح نہیں تھے جیسا کہ محدثین نے حدیث کے بارے میں کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ جاہلی اشعار کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے۔ جس کی سند بیان کی گئی ہو اور اس کے راویوں کے حالات کو اس طرح مکمل طور پر منضبط کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ہمارے پاس صحیح بخاری اور مسلم وغیرہ موجود ہیں۔ جب کہ ہم جاہلی اشعار کو عرب کا دیوان شمار کرتے ہیں۔ جن میں ان کے وقائع و حوادث اور ان کے اخلاق و عادات کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ تو ہمیں ان اشعار کے ساتھ یہ تمام اہتمام کرنے ضروری تھے۔ ہمیں ان اشعار کی طرف اس نگاہ سے دیکھنا چاہیئے تھا۔ جیسا کہ تاریخی دستاویز کی طرف دیکھا جاتا ہے۔ لیکن جاہلی اشعار کی طرف عموماً اس نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ رواۃ اور ادباء قطعاً اس طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ وہ لوگ ان اشعار کی طرف محض اس نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ زبان و لغت کی تعلیم کا سرچشمہ یا لطائف و ظرائف کا ذریعہ اور حسن گفتگو کا منبع تھا۔ ان اشعار کے ساتھ وہ اہتمام نہیں کیا گیا جو مثلاً حدیث کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کسی راوی کو ان اشعار کے متعلق کبھی یہ اندیشہ بھی نہیں ہوا کہ جو شخص ان میں جان بوجھ کر جھوٹ بولے گا۔ اس کا ٹھکانا جہنم بن جائے گا۔

کچھ ادیبوں نے ادب میں بھی وہی طریقہ اختیار کرنا چاہا تھا جو حدیث میں رائج تھا۔ چنانچہ وہ لغات کو عنعنہ (میں نے اس سے اور اس نے فلاں سے اور فلاں نے فلاں سے) کے ساتھ سند کے ساتھ بیان کرنا چاہا۔ بعض لوگوں نے ادب کی روایت کے لئے حدیث کی اصطلاحات کے نمونہ پر کچھ اصطلاحات بھی مقرر کیں۔ لیکن ان کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض ابتدائی کوششوں کی حد تک ہی رہ سکیں۔ اور وہ پختگی حاصل نہیں کرسکیں۔ یہ ادیب اس طریقہ پر چل کر کسی انتہا تک نہیں پہنچ سکے۔

ایسے ہی زیادہ تر جاہلی اشعار جو بیان کئے گئے ہیں وہ منتخب اشعار ہیں۔ اور منتخب اور بہترین اشعار کو جمع کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے۔ یہ حضرات ان اشعار کی طرف ایک ادیب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک مؤرخ کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ قصیدہ جس کی نشست الفاظ زیادہ محکم اور بہتر نہ ہو۔ جس کے الفاظ زیادہ تر نگینوں کی طرح ترشے ہوئے نہ ہوں۔ جس کا وزن زیادہ تر صحیح اور مستقیم نہ ہو اسے ایک مؤرخ بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے اتنی پسندیدگی کی نگاہ سے جتنی وہ ایک ہر جہت سے مکمل قصیدہ کو نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس میں اسے عربوں کی حیات عقلیہ کے تدریجی ارتقاء کی طرف رہنمائی ملتی ہے جو ایک بلند مرتبہ قصیدہ میں نہیں مل سکتی اس سے وہ اندازہ کرسکتا ہے کہ عربوں نے جب ابتداءً شعر گنگنانے شروع کئے تھے تو ان کی کیا نوعیت ہوا کرتی تھی اور آہستہ آہستہ وہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے کس منزل تک کتنے عرصہ میں پہنچے گئے ہیں۔ ایسا ہونا اسی وقت ممکن ہوسکتا تھا کہ جب ہمارے پاس عربوں کی مختلف ارتقائی منزلوں سے متعلق اشعار کا ذخیرہ موجود ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں کیا ہمارے پاس جو اشعار کا ذخیرہ ہے وہ عربوں کی صرف آخری ارتقائی منزل سے متعلق اشعار کا ذخیرہ ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ باوجودیکہ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ شعر و شاعری بھی نشو و ارتقاء کی ان تمام منازل سے گذری ہے۔ جن سے دوسری علمی چیزیں گذری ہیں۔ لیکن بہت ہی کم ایسا ملے گا۔ کہ کسی مصنف نے کوئی ایسے اشعار نقل کئے ہوں جن سے معلوم ہوسکے کہ عرب کے شعراء نے ابتداءً شعر کہنے کس طرح شروع کئے تھے؟

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

باب اوّل ۔ دربیان اینکہ اصل نظامِ عالم از خودی است و تسلسلِ حیاتِ تعیناتِ وجود بر استحکامِ خودی انحصار دارد۔

اب ہم تمہید کے بعد اصل مثنوی پر آپہنچے ہیں۔ اس کے پہلے باب کا عنوان، جسے ہم نے اوپر درج کردیا ہے، اقبال کے مرکزِ فکر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں حضرت علامہ نے دو باتیں کہی ہیں۔ (۱) اصل نظامِ عالم از خودی است۔ (۲) تسلسلِ حیاتِ تعیناتِ وجود بر استحکامِ خودی انحصار دارد۔

خودی کے متعلق ہم، شروع میں، مختلف اطراف و جوانب اور متعدد نقاطِ نگاہ سے اس قدر شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں کہ اب اس کی مزید تفصیل و تشریح کی ضرورت نہیں۔ بہتر ہے کہ آپ ایک مرتبہ اُن مباحث کو سامنے لے آئیں تاکہ اس کے صحیح مفہوم کی یاد تازہ ہو جائے۔ فکرِ اقبال کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تمام عالم خودی ہی کے ذوقِ نمود کا مظہر ہے۔ خودی، زندگی اور توانائی ہے لیکن یہ توانائی مشہود اس وقت ہو سکتی ہے جب یہ اپنے آپ کو مقید کردے۔ جب کوئی ذات اپنے آپ کو مقید کرتی ہے تو تصوف کی اصطلاح میں اسے "تعیّن" کہا جاتا ہے۔ یعنی تصوف کی رُو سے یہ تعینات کے پردے ہیں جو کسی شے کے وجود کا موجب بنتے ہیں۔ اقبال نے "تعیناتِ وجود" کی اصطلاح تو تصوف کے لٹریچر ہی سے لی ہے۔ لیکن خودی کے متعلق اس کا بنیادی تصور، تصوف کے تصور سے بالکل متضاد ہے۔ (اس کی تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)

مثنوی کے پہلے باب کے عنوان میں جن دو امور کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ نظامِ عالم کی اصل خودی سے ہے۔ نظامِ عالم کی اصطلاح سے اقبال نے ذہن کو اس طرف منتقل کردیا کہ کائنات میں ایک نظم و ضبط ہے۔ یہ وہ تصور ہے جو خدا کے ماننے والوں کو مادہ پرستوں سے بالکل الگ کردیتا ہے۔ "نظم" سے مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر چیز ایک قاعدہ اور قانون کے ماتحت چل رہی ہے اور کائنات کی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے۔ اس لئے کہ جب تک مقصد متعین نہ ہو حرکت بے معنی ہو جاتی ہے۔ حرکت ایک نظام کے تابع اُسی صورت میں رہتی ہے جبکہ اس کا رُخ کسی متعین نقطہ کی طرف ہو۔ لیکن سمت یا اس کا منتہیٰ متعین نہیں ہو سکتا جب تک پہلے اس پورے پروگرام کا مقصد متعین نہ ہو۔ لہٰذا نظامِ عالم کی اصطلاح سے اقبال اس تصور کو سامنے لے آیا ہے کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔ ایک مقصد کے ماتحت۔ ایک نظم و ضبط کے تابع۔ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ کائنات کا بالحق وجود میں آنا خودی کے ذوقِ نمود ہی کی وجہ سے ہے۔ خودی اپنے ذوقِ نمود سے تعینات میں گھر کر مقید ہو جاتی ہے اور اس طرح اپنے اوپر خود عاید کردہ پابندیوں سے ایک محسوس اور مشہود شکل اختیار کرلیتی ہے جو قاعدہ اور قانون کے ماتحت باقی رہتی اور قاعدہ اور قانون ہی کے مطابق آگے بڑھتی ہے۔

یہ حقیقت کہ خودی، تعینات کے پردوں کے اندر مقید ہو کر ہی وجود پذیر یا محسوس و مشہود ہو سکتی ہے ایک مثال سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ بجلی (Electricity) کیا ہے؟ اس کے متعلق ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ حرکتِ محض (PURE MOTION) یا توانائی (ENERGY) ہے۔ لیکن جب یہ حرکتِ محض یا توانائی کسی شے کے اندر محصور ہو جاتی ہے تو ہم اس (ELECTRIFIED OBJECT) سے خود بجلی کا احساس کرلیتے ہیں۔ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ خودی، توانائی یا زندگی ہے۔ وہ جب اپنے آپ کو متعین یعنی مقید کرلیتی ہے تو پھر وہ منفرد (INDIVIDUALISED) یا متشخص (PERSONIFIED) ہو جاتی ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہتے ہیں کہ خودی، وجود پذیر ہو گئی۔ یعنی اس نے ایک شکل (FORM) اختیار کرلی۔ اقبال نے اپنے خطبات میں کہا ہے کہ "زندگی جہاں بھی ہے منفرد ہے۔ عالمگیر حیات کوئی شے نہیں۔ خدا خود ایک فرد ہے۔ بے مثال و نظیر فرد۔ یعنی احدیت اور صمدیت کا حامل انائے مطلق۔"

اب ہم فکرِ اقبال کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں۔ اقبال کہتا ہے کہ جب خودی ایک معین شکل یا وجود اختیار کرلیتی ہے۔ یعنی جب اسے انفرادیت یا تشخص حاصل ہو جاتا ہے۔ تو اس کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی یہ انفرادیت باقی رہے اور آگے بڑھے۔ اس کا نام اقبال کی اصطلاح میں "تسلسلِ حیاتِ تعیناتِ وجود" ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی اسی طبعی زندگی کا نام نہیں۔ اگر خودی مستحکم ہو جائے تو وہ اس طبعی زندگی کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور ارتقا کی اگلی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اس حقیقت کی تبیین سے اقبال نے ایک بہت بلند تصور کو پیش کیا ہے۔ وہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں کہ "خودی کی انفرادیت یا تشخص کا تصور، کائنات میں اقدار کا معیار بہم پہنچاتا ہے۔ اس معیار کی رُو سے "خیر" اس عمل کو کہتے ہیں جو خودی کو مستحکم کرے اور "شر" وہ ہے جو خودی کی کمزوری کا باعث بنے۔ اگر کوئی فرد ایسے اعمال کا حامل بنے جو اس کی خودی کو مستحکم کرتے ہیں تو یہ خودی حیاتِ جاوید حاصل کرلیتی ہے۔ (انہی کو قرآن نے "اعمالِ صالحہ" کہہ کر پکارا ہے) اس کے برعکس اگر اس سے ایسے اعمال سرزد ہوں جن سے خودی میں ضعف پیدا ہو تو وہ زندگیٔ جاوید کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس لئے اقبال کی بنیادی فکر کا دوسرا گوشہ یہ ہے کہ زندگی کا تسلسل استحکامِ خودی پر منحصر ہے۔ اقبال کا پیغام اور اس کا پورے کا پورا فلسفہ، اسی بنیادی فکر کی تشریح ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے یہ تصوف سے بالکل متضاد سمت میں چلا جاتا ہے۔ تصوف (یا ویدانت) کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ جب تک انسانی خودی باقی رہتی ہے، روح اپنی اصل (یعنی ذاتِ خداوندی) سے دور اور الگ رہتی ہے۔ زندگی کا منتہائے کمال یہ ہے کہ انسانی خودی کو فنا کردیا جائے تاکہ جُزو اپنے کل میں جذب ہو کر عشرتِ دوام حاصل کرے۔ یعنی تصوف میں، مقصودِ زندگی، فنائے خودی ہے اور اقبال کے ہاں، استحکامِ خودی۔ مثنوی اسرار و رموز میں اسی فلسفہ سے بحث کی گئی ہے اور وہ طریقِ عمل بتایا گیا ہے جس سے انسانی خودی استحکام حاصل کرسکتی ہے۔

عنوان کی اس مختصر سی تشریح کے بعد، اب ہم اصل مثنوی کی طرف آئیں گے۔

عورت قرآن کا

(۲/۱)

"ماں" اور "بیٹی" سے نکاح

قرآن مجید نے محرمات نکاح میں "ماں اور بیٹی" کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ "نانی اور پوتی" سے نکاح درست ہے جس طرح "ولد" سے مراد صرف بیٹا ہی نہیں بلکہ بیٹے کی اولاد بھی ہے جس طرح والد کے معنی صرف باپ نہیں بلکہ دادا اور پردادا بھی ہیں۔ اسی طرح "ماں" سے مقصود صرف "ماں" نہیں بلکہ اس کے اوپر کے تمام افراد۔ اور "بیٹی" سے مطلب محض بیٹی نہیں بلکہ اس کے نیچے کے سارے لوگ بھی ہیں۔ اس لئے ان سب کا شمار محرمات نکاح میں ہوگا

دو بہنوں کا ایک ساتھ جمع ہونا

قرآن مجید میں صرف دو سگی بہنوں ہی کے اکٹھا کرنے کی ممانعت مذکور ہے مگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کا جمع کرنا بھی منع کر دیا ہے مالک رام اپنی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" میں صحیح فرماتے ہیں کہ:-

> اس سے یہ ایک عام اصول مستنبط ہوتا ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی دو عورتیں بیک وقت جمع نہیں کی جا سکتیں کہ اگر ان میں سے ایک مرد ہوتی، تو دوسری سے اس کا نکاح حرام ہوتا۔ یعنی اگر ان دونوں کا رشتہ ایسا ہے کہ ایک کے مرد ہونے کی صورت میں نکاح حرام ہو جاتا، تو وہ دونوں عورتیں ایک شخص کے نکاح میں بھی جمع نہیں ہو سکتیں:" (صفحہ ۶۲)

اگر اس حدیث کی صحت تحقیق و تصدیق ہو جائے تو یقیناً یہ اصول مستنبط ہو جاتا ہے بات یہ ہے کہ ہمیں پہلے جاننا یہ چاہیئے کہ احکام الٰہی کیا ہیں؟ اس علم کے بعد اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خدا کا حکم ہے کہ فلاں چیز حرام نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ حرام نہیں ہے اس لئے جائز ہے یا یہ کہ حرام چیزوں میں سوائے مردار، بہتا ہوا خون، سؤر اور اس چیز کے جو غیر اللہ سے نامزد ہوئی ہو۔ پانچویں کوئی چیز حرام نہیں بتائی گئی ہے مگر اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ مسلمان کتا۔ بلی۔ چوہا کھانے ہی لگیں۔ مرتع تقاضائے صحت پسندیدہ و مرغوب اور مقتضائے مصلحت کیا ہے؟ یہ دیکھنا تو مسلمان کا فرض عین ہے۔

رضاعی بہن سے نکاح

عام طور سے یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ رضاعی ماں کی کسی اولاد سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل غلط ہے رضاعت کی مدت خود قرآن مجید نے دو سال بتائی ہے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ
كَامِلَيْنِ (بقرہ ۳۰)

اور پورے دو برس تک ماں بچے کو دودھ پلائے

یہ دو سال اگر کوئی بچہ کسی عورت کا دودھ پیئے۔ تو وہ عورت اس کی ماں کی حیثیت رکھے گی۔ اور جس بچی نے اس بچے کے ساتھ دودھ پیا ہے۔ ان دونوں کا باہم نکاح نہیں ہو سکتا۔ اور از روئے حدیث تو حرمت رضاعت صرف ایسے موقع پر دودھ پلانے سے متعین ہوگی۔ جب بچے کو بھوک کی حالت میں دودھ پلایا جائے محض دو ایک گھونٹ پی لینا بھی حرام نہیں کرتا۔ یعنی کوئی عورت کسی بچے کو یونہی چند گھونٹ تفریحاً دودھ پلائے تو وہ عورت اس بچے کی رضاعی ماں نہ ہو جائے گی۔ لیکن اگر قرآن مجید ہی کو سامنے رکھا جائے تو بھی یہ ثابت ہے کہ "رضاعی ماں کی ہر اولاد سے نکاح حرام نہیں بلکہ صرف ان دونوں کا نکاح نہیں ہو سکتا جن بچوں اور بچیوں نے ساتھ دودھ پیا ہے۔ اسی طرح دو سال تک کی عمر تک ہی "رضاعت" محدود ہے۔ اس عمر میں جو بچہ کسی عورت کا دودھ پیئے گا۔ وہ عورت اس کی "رضاعی ماں" ہوگی۔ لیکن اس عمر کے بعد اگر کوئی ضرورتاً یا سہواً یا قصداً کسی عورت کا دودھ پی لے تو وہ عورت اس کی "رضاعی ماں" ہرگز نہ ہوگی۔ آج مسلمانوں میں بہت سی موزوں شادیاں محض اس لئے رک جاتی ہیں کہ دودھ پلانے والی رضاعی ماں کی سب اولاد رضاعی بھائی یا بہنیں کہی جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر خلاف قرآن ہے۔[1]

متبنّٰی بیٹے کی بیوی سے نکاح

زیادہ تر وہ لوگ جن کو اولاد نہیں ہوتی۔ اور کمتر بعض صاحب اولاد بھی کسی بچے کو گود لے کر بطور اولاد پرورش کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ وہ سارے سلوک و مراسم ادا کرتے ہیں۔ جو اپنی صُلبی اولاد سے کئے جاتے ہیں۔ اور عربی میں "متبنّٰی" اور ہندی میں "لے پالک" کہتے ہیں۔ یعنی لے کر پالا ہوا۔ گود لیا ہوا۔ فرزندی میں قبول کیا ہوا۔ ایسا بیٹا حقیقتاً تو بیٹا ہوتا نہیں۔ مگر کہنے سے یوں ہی کہا جاتا ہے اسی لئے اس کو "منہ بولا بیٹا" بھی کہا جاتا ہے اپنے حقیقی بیٹے کی بیوی سے نکاح نہ کرنے کا رواج عرب میں اسلام سے پہلے بھی تھا۔ اور قرآن مجید نے بھی "بہو" سے نکاح کو حرام قرار دیا۔ مگر "منہ بولے بیٹے" کو جو حقیقی بیٹا تصور کرکے اہل عرب ان کی بیویوں سے بھی نکاح کو ناجائز سمجھتے تھے۔ قرآن مجید نے اس کی تردید و تغلیط کی۔ اور ایام جاہلیت کے اس خیال کا ابطال کیا۔ اور بتایا کہ وہ حقیقتاً بیٹا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی منکوحہ سے نکاح جائز ہے۔ مگر آج کل زمانہ مسلمانوں میں جاہلیت کی یہ رسم پھر جاری و ساری ہے کہ وہ متبنّٰی کی بیویوں کو حقیقی "بہو" تصور کرکے ان سے نکاح کو ناجائز سمجھتے ہیں، چاہے اس کا حشر جو کچھ بھی ہو۔ اور اس حماقت سے معاشرہ میں کیسا ہی کچھ فساد برپا کیوں نہ ہو جائے۔

حضرت زید کے سلسلہ میں سورۂ احزاب کے پانچویں رکوع کی جو آیت نقل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے اس سورہ کی ابتدا ہی میں ایک آیت یہ ہے:-

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم
بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ (احزاب)

اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا ہے یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے۔ اور اللہ حق بات فرماتا ہے اور وہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

اس آیت میں بالکل واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ "منہ بولا بیٹا" سچ مچ "بیٹا" نہیں ہو جاتا اور وہ "صلبی اولاد" کی طرح نہیں ہوتا بلکہ غیر ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد اسی سورہ کے پانچویں رکوع میں حضرت زید اور حضرت زینب کا قصہ بیان کیا گیا۔ اگرچہ بظاہر وہ آیت ذات رسالت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے اس کو "امہات المومنین" کے سلسلہ میں درج کیا گیا ہے مگر چونکہ جیسا کہ خود قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔ وہ صرف ایک قصہ نہیں بلکہ "قانون اسلامی" کی ایک "دفعہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور صرف ذات رسالت ہی سے متعلق نہیں بلکہ اس میں ایک اصول بیان کیا گیا ہے۔ جس کا سرو کار امت سے بھی ہے۔ لہٰذا وہ آیت یہاں بھی نقل کی گئی ہے۔ جس میں صاف مذکور ہے کہ اگر کسی شخص کو متبنّٰی اور منہ بولا بیٹا بنا لیا جائے تو وہ حقیقتاً بیٹا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ وہ بدستور غیر کا غیر ہی رہتا ہے۔ لہٰذا منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح جائز ہے۔ وہ حقیقی "بہو" نہیں ہو جاتیں جس سے نکاح حرام کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالٰے نے اس قانون کو صرف "قال" ہی تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ خود "حال" تک پہنچا دیا ہے اور فرمایا کہ اے رسول ہم نے تمہارے منہ بولے بیٹے زید کی بیوی سے جب کہ زید نے طلاق دیدی ہے۔ تمہارا نکاح کر دیا۔ اور یہ اس وجہ سے تاکہ:-

> "منہ بولے بیٹوں کی" بیویوں کے" بارے میں "مسلمانوں" پر کوئی تنگی نہ رہے"۔

یعنی ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلمان ایسا کرنے میں کبھی کوئی رکاوٹ اور کسی طرح کی جھجک محسوس نہ کریں۔ چنانچہ اگرچہ آنحضرت صلعم کے پیغام نکاح پر، عدت گذر جانے کے باوجود، حضرت زینب نے فرمایا تھا کہ "ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی" اس لئے کہ حضرت زینب رواج سے متوحش اور سماج سے خائف تھیں۔ مگر جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان کا اندیشہ دور ہو گیا۔ اور انھوں نے رسول اللہ صلعم کا پیغام قبول کرکے نکاح کر لیا۔ مگر آج کوئی بھی نہیں سوچتا کہ وہ رسول سے زیادہ معزز تو نہیں ہے۔ پھر کتنی عورتیں ایسی ہیں۔ جن کی زندگی تو تباہ کر دی جاتی ہے۔ مگر ان سے نکاح کرتے ہوئے لوگ شرماتے ہیں کہ دنیا ہنسے گی۔ نعوذ باللہ۔

---

[1] مصنف کا قرآن سے یہ استدلال محل نظر ہے۔ قرآن کے الفاظ سے تمام رضاعی بہنوں کی حرمت ہی معلوم ہوتی ہے (طلوع اسلام)

مسند امام احمد بن حنبل

(علامہ تمنا عمادی مدظلہٗ)

مسند امام احمد بن حنبلؒ حدیث کی بڑی اہم کتابوں میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام صاحبؒ نے ڈیڑھ لاکھ احادیث سے انتخاب کرکے یہ مجموعہ مرتب فرمایا تھا جس میں قریب تیس ہزار احادیث درج کی گئیں حدیث کے ایسے اہم مجموعہ کے متعلق، علامہ تمنا عمادی کا یہ تحقیقاتی مضمون بڑے غور و فکر کے مطالعہ کا متقضی ہے۔

طلوع اسلام

حدیث کی بعض کتابیں متاخرین نے خود جمع کیں مگر ان کو اگلے بزرگوں میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو عوام ہیں بعض خواص بھی کچھ دنوں کے بعد اس نسبت سے دھوکا کھا گئے اور اس کتاب کو انہیں بزرگوں کی تالیف سمجھنے لگے جن کی طرف اس کی نسبت کر دی گئی تھی۔

حافظ ابن حجرؒ نے تعجیل المنفعۃ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے مسند امام شافعیؒ اور مسند امام ابو حنیفہؒ کا ذکر اس طرح کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے وہ ان کتابوں کو ان بزرگوں کی خاص تالیف سمجھتے تھے، حالانکہ مسند شافعی کو بعض نیشاپوریوں نے کتاب الام وغیرہ سے اور بعض حدیثیں ابو العباس اصم سے لیکر جن کو وہ تنہا ربیع بن سلیمان سے روایت کرتے تھے ایک مسند شافعی مرتب کر رکھی تھی۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے تین سو برس بعد ابو محمد الحارثی نے امام ابو حنیفہ ہی کے شیوخ پر کچھ حدیثیں مرتب کرکے ایک مجموعہ تیار کیا اس کا نام مسند ابی حنیفہ رکھدیا۔ اس کے بعد اسی میں سے مرفوع حدیثیں چن کر ابو بکر بن المقری نے ایک مختصر سی مسند ابی حنیفہ مرتب کی پھر حافظ ابو الحسن ابن المظفر نے بھی ایک مسند ابی حنیفہ جمع کی اور سب سے آخر میں ابن خسرو نے ایک ضخیم مسند ابو حنیفہ لکھ ڈالی جو اگلی کتابوں کی جامع ہے۔

تو جب ابن حمزہ الحسینی جیسے محدث و رجال جو ابن حجر سے بھی متقدم تھے۔ صرف نسبت کی وجہ سے دھوکا کھا گئے تو تا بدیگراں چہ رسد۔

مگر یہ جامعین مسند چونکہ امام شافعیؒ و امام ابو حنیفہؒ سے بہت زیادہ متاخر تھے اور پھر ان کی یہ جمع و تالیف کسی خاص اجتماعی سازش کے ماتحت نہ تھی بلکہ مختلف اشخاص کی الگ الگ کوششیں تھیں اور ہر مؤلف کی کوشش خاص اپنے ہی فرقہ کی تائید میں تھی جس کی وجہ سے دوسرے فرقہ والوں نے ان کتابوں کی نسبتوں کو صحیح ثابت نہ ہونے دیا اور خود اس فرقے کے ثقہ لوگوں نے بھی دوسروں کی تکذیب کی تائید کی، جیسا کہ ابن حجرؒ نے خود اعتراف کیا کہ مسند شافعی امام شافعیؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان کے بہت بعد بعض نیشاپوریوں نے اس کی تالیف کی۔

بخلاف مسند امام احمد کے یہ ایک خاص اجتماعی سازش کے ماتحت جمع کی گئی اور اس کے جامعین کی غرض ہی یہی تھی کہ اسکو جس طرح بھی ہو خاص امام احمد کی تالیف ثابت کرکے رہیں اور اس کا اہتمام امام احمد کی وفات کے کچھ بعد ہی سے نہیں بلکہ عجب کیا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی کے وقت ہی سے اس کی تالیفی داغ بیل ڈال دی گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسند امام شافعی کے جامع کی غرض اس کتاب سے مسلک امام شافعی کی تائید تھی اور مسند امام ابی حنیفہ کے جامع کی غرض سے اس کتاب سے مذہب امام ابو حنیفہ کی تائید تھی۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک میں اپنے اپنے رنگ کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں۔

مگر مسند احمد میں مسلک امام احمد کے موافق و مخالف ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں جمع کر دی گئیں ہیں اور اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے کہ ہر فرقے کے موافق بھی کچھ حدیثیں اس میں ملتی ہیں اور مخالف بھی۔

مسند شافعی سے صرف شوافع ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور مسند ابی حنیفہ سے صرف احناف ہی کام نکال سکتے ہیں دوسرے فرقے والے ان کتابوں سے بہت کم مستفید ہو سکتے ہیں۔ مگر مسند احمد سے جس طرح مستفیض ہوتے ہیں بالکل اسی طرح شوافع و احناف و مالکیہ بھی اور صوفیہ اور شیعہ کے لئے تو یہاں خزانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے یہاں تک کہ زنادقہ و ملاحدہ بھی اس کی بارگاہ سے محروم نہیں جا سکتے۔

عزازیل گوید نصیبے برم

یہی وجہ ہے کہ مسند شافعی سے احناف کو اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے۔ مسند ابی حنیفہ پر شوافع وغیرہم طعن کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ مگر مسند احمد کی پالائش سب کے سب کر رہے ہیں کیونکہ یہ مجموعہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ کی ایک عجیب و غریب تماشا گاہ ہے۔ مسند احمد میں چونکہ ہر فرقے کے موافق بھی روایتیں ہیں اور مخالف بھی، اس لئے ہر فرقہ اس کی بعض حدیثیں لینے کے لئے جس طرح ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے اسی طرح بعض کی طرف سے ہاتھ کھینچ بھی لیتا ہے اس کے لئے بات یوں بنائی جانے لگی کہ اس میں کچھ تو حدیثیں خاص امام احمد کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور کچھ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کے اضافے ہیں۔ ان میں کچھ ضعیف حدیثیں بھی ضرور ہیں اور کچھ حدیثیں عبداللہ بن احمد کے شاگرد ابوبکر قطیعی کی بڑھائی ہوئی ہیں جن میں ضعیف ہی نہیں بلکہ کچھ موضوعات بھی ہیں۔ اس تقسیم کے بعد ہر فرقے کو اسکا موقع مل جاتا ہے کہ جو حدیث اس کے موافق اس ذخیرے میں ملتی ہے اس کو وہ خاص امام احمد کی حدیث بتاتا ہوا اس کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے اور جو حدیث اسکے مخالف ملتی ہے اس کو عبداللہ کے زیادات یا ابوبکر قطیعی کے اضافے قرار دے کر رد کر دیتا ہے۔

رجال کی چھان بین کرنے والوں کی کافی تعداد دوسری صدی کے اواخر ہی سے پیدا ہو چکی تھی اور یہ فن روز افزوں ترقی پر مدتوں تک رہا۔ مگر باوجود کافی تفحص اور قابل رشک دیانت داری کے نفسانی رجحانات سے ائمہ رجال بھی محفوظ نہ رہ سکے اور جس طرح امام مالکؒ امام احمد اور بخاری و مسلم کے شیوخ سے جہاں تک ہو سکا چشم پوشی سے کام لیا گیا اسی طرح ایسے لوگوں کے متعلق بھی عفو و درگزر سے حتی الوسع کام لیا گیا جن سے روایات کا کوئی خاص مقصد وابستہ تھا۔ مثلاً حفص و حمزۂ زیات وغیرہما جیسوں کے احکام و سنن کی کبھی کوئی روایت معتبر نہیں سمجھی گئی، مگر اختلاف قرأت کی روایتیں ضرور ان سے لی گئیں، ورنہ وہ قرأتیں جو ان سے مروی ہیں، معدوم ہو جاتیں اور ان کے معدوم ہونے سے قاریوں کے نزدیک قرآن کا ایک حصہ ہی معدوم ہو جاتا۔

اسی طرح سدی و کلبی وغیرہما۔ کہ ہر چند احکام و سنن میں ان جیسوں کی کوئی روایت مقبول نہیں ہوئی، کیونکہ یہ لوگ بالاتفاق وضاع و کذاب ہیں، مگر تفسیری روایتیں کم سے کم سچانوے فیصدی انہیں جیسوں سے مروی ہیں۔ اگر ان لوگوں کو نامعتبر قرار دیکر ان کی تفسیری روایتیں رد کر دی جائیں تو پھر یہ تفسیر کا ذخیرہ تو بالکل غائب ہی ہو جائے گا۔

بالکل اسی طرح مسند احمد کی دو راوی ابوبکر قطیعی جو مسند کی روایت عبداللہ بن امام احمد سے تنہا کر رہے ہیں اور ابن المذہب جو ابوبکر قطیعی سے تنہا مسند کی روایت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں غیر ثقہ اور حقیقۃً ناقابل اعتبار ہیں، مگر ان کو ناقابل اعتبار قرار دیکر ان کے واسطے سے جو مسند احمد کا ذخیرہ مل رہا ہے اس کو غیر مستند سمجھتے ہوئے محدثین رد کر دیتے، تو پھر اسی نعمت عظمیٰ جس سے ہر فرقہ کا کام نکل رہا ہو، کہاں ملتی! اسلئے جس طرح قرأت کے لئے حفص و حمزہ کو گلے لگانا پڑا، اور تفسیری روایتوں کی خاطر سدی و کلبی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے لگوا لیا گیا۔ اسی طرح مسند احمد کی ضرورت نے ابوبکر قطیعی و ابن المذہب کی پالائش کرنے پر محدثین و ائمہ رجال کو مجبور کر دیا۔

متقدمین نے تو اتنا بھی اعتراف کیا تھا کہ اس انبار روایات میں بعض موضوع روایتیں بھی ہیں مگر وہ صرف ابوبکر قطیعی کے اضافے والی روایتیں ہیں، چنانچہ ابن جوزیؒ[1] و علامہ عراقی[2] نے مثلاً بعض روایتوں کو موضوع قرار دیکر پیش بھی کیا تھا مگر بعد والے اس مسند کے ساتھ اسقدر غلو پیدا کر چکے تھے کہ اس کو بھی برداشت نہ کر سکے کہ ابوبکر قطیعی ہی پر الزام رکھتے ہوئے سہی، اس کتاب میں کسی موضوع حدیث کا وجود بھی تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ جو خود اپنی کتاب لسان المیزان ج ۲ ص ۱۴۳ میں ابن المذہب اور ان کے شیخ ابوبکر قطیعی دونوں کو غیر ثقہ قرار دیتے ہوئے امام ذہبی کا قول نقل کر رہے ہیں کہ "اسی لئے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہو گئیں، جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے نہ اسناد ہی!" انہیں ابن حجر نے ابن جوزی و عراقی کے جواب اور مسند احمد کی حمایت میں ایک کتاب ہی لکھ ڈالی جس کا نام القول

[1] ابوالفرج عبدالرحمن بن علی الجوزی، ولادت ۵۰۸ھ سے ۵۱۰ھ تک کے اندر وفات ۵۹۷ھ۔ [2] حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی، ولادت ۷۲۵ھ وفات بروایت صحیحہ ۸۰۶ھ ان کی کتاب "الفیۃ الحدیث" مشہور و معروف ہے

المسدد فی الذب عن مسند احمد ہے اس میں ان تمام حدیثوں کو جنھیں ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی موضوع قرار دیا تھا۔ یہ صحیح ہی نہیں بلکہ بعض کو تو متواتر یا قریب متواتر تک بزعم خود ثابت کر دکھایا ہے۔

اخی المکرم مولانا عبداللہ الاعجمی مدرس سینیر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے برسبیل تذکرہ ابن حجر کی اس بیجا حمایت کا ذکر آیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ان میں سے کسی ایک حدیث کو بھی بہ کوشش کر کے موضوع ثابت کر دیجئے اور ابن حجر کے دلائل کو باطل کر دکھائیے تو میں جانوں۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ "آپ ہی ان میں سے کسی ایک حدیث کو چن دیجئے" بھائی صاحب مرحوم و مغفور نے مسند والا ابواب المسجد (الابواب) والی حدیث پیش کی کہ "اس کو ابن جوزی اور عراقی دونوں ہی نے موضوع قرار دیا ہے اور ابن حجر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اسکو قریب بمتواتر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کر دکھایا ہے آپ ابن حجر کے دلائل کو غلط ثابت کر کے اس حدیث کو واقعی موضوع اور حقیقۃً شیعوں کا افترا ثابت کر دکھائیے"۔ بتوفیقہ تعالیٰ میں نے ایک ہفتہ کے اندر ابن حجر ہی کی کتابوں سے ابن حجر کے اقوال و دلائل کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور دکھا دیا کہ یہ حدیث درحقیقت موضوع ہی ہے۔ بھائی صاحب ممدوح میرے مختصر رسالہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑی داد دی اور ابن حجر کی اس بیجا حمایت پر سخت متاسف ہوئے۔ رحمھم اللہ تعالیٰ و عفا عنھم

اسناد مسند احمد

اس مسند کے اسناد جہاں کہیں ملتے ہیں اسی سلسلۂ روایت سے ملتے ہیں کہ صرف حنبل بن عبداللہ الرصافی ہی سے دوسرے مختلف لوگ روایت کرتے ہیں اور حنبل بن عبداللہ الرصافی تنہا اس کی روایت شیخ ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن محمد بن عبدالواحد[1] بن احمد بن الحسین الشیبانی سے کرتے ہیں اور وہ تنہا ابو علی الحسن بن علی بن محمد التمیمی الواعظ عرف ابن المذہب سے۔ وہ تنہا ابوبکر احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک القطیعی سے۔ وہ تنہا عبداللہ بن الامام احمد سے وہ تنہا اپنے والد ماجد امام احمد بن محمد بن حنبل سے۔

مسند احمد کے تمام قدیم و جدید قلمی و مطبوعہ نسخوں کو دیکھئے بسم اللہ کے بعد ہی اس کا آغاز اخبرنا سے ہوتا ہے یہ اخبرنا کہنے والے کون ہیں اللہ ہی کو معلوم ممکن ہے کہ اس جمع یا تثنیہ متکلم میں حنبل بن عبداللہ الرصافی بھی ہوں۔ مگر حنبل بن عبداللہ الرصافی اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ کا حال مجھ کو باوجود جستجو کے رجال کی کسی کتاب میں کہیں نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ طبقات الحنابلہ وغیرہ میں کہیں مذکور ہوں مگر اتنا ضرور ہے کہ حنبل بن عبداللہ اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ ان دونوں کے نام صرف اسی مسند ہی کے سلسلۂ اسناد میں آتے ہیں اس کے سوا کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ وفیہ ما فیہ۔

بہرکیف ان کے بعد ابن المذہب ہی کا نام آتا ہے تو اب ابن المذہب کا حال سنئے:۔

ابن المذہب

ابوالقاسم ہبۃ اللہ کے شیخ ابن المذہب یعنی الحسن بن علی بن محمد ابو علی بن المذہب الواعظ التمیمی البغدادی، ابوالقاسم ہبۃ اللہ کی طرح یہ واحد راوی ہیں پورے ذخیرۂ روایات یعنی مکمل مسند احمد کے ہیں۔ یہی تنہا اس مسند کی روایت ابوبکر قطیعی سے کرتے ہیں اور ابوبکر قطیعی عبداللہ سے وہ اپنے والد امام احمد سے۔

امام ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں انکا مفصل حال لکھتے ہیں۔ دونوں ہی ان کے متعلق خطیب بغدادی کا قول نقل کرتے ہیں کہ "ابن المذہب کا ابوبکر قطیعی سے مسند احمد کا سننا تو صحیح[2] ہے مگر پوری کتاب کا نہیں بعض اجزاء کا سننا ثابت نہیں مگر ابن المذہب نے ان غیر مسموعہ اجزاء کو بھی مسموعہ کے ساتھ ملا لیا تھا اور امام احمد کی کتاب الزہد کو دیکھ کر اس کی بھی روایت کرنے لگے، حالانکہ اس کا اصل نسخہ[3] ان کے پاس نہ تھا خود اپنے ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے سے روایت کیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ محل حجت نہیں"

ذہبی و ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ابن المذہب ۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور نواسی سال کی عمر پا کر ۴۴۴ھ میں وفات پائی۔ مسند فضالہ بن عبید اور مسند عوف بن مالک، ابن المذہب کے نسخے میں نہ تھے اسی طرح مسند جابر کی وہ بعض حدیثیں بھی نہ تھیں، جن کو حرانی[4] نے قطیعی سے روایت کیا ہے"

پھر حافظ ابن حجر امام ذہبی کا معترضانہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ جب ایک شخص بقول خطیب کسی کتاب کی روایت کے سلسلے میں اپنا نام جوڑ سکتا ہے تو یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یعنی مسند فضالہ اور مسند عوف اور مسند جابر میں کی چند احادیث کا الحاق بھی (اپنی طرف سے) کر لیا ہوگا"

اتنا لکھ کر پھر حافظ ابن حجر امام ذہبی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ شجاع ذہلی نے کہا ہے کہ ابن المذہب ۔ روایتوں میں معتمد علیہ نہ تھے مبلغی نے کہا کہ یہ ہمیشہ محل گفتگو رہے کتاب الزہد کے معدوم[5] ہو جانے کے بعد بغیر اصل کتاب کے خود اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کتاب الزہد کی روایت کیا کرتے تھے۔ خطیب نے کہا کہ ابن المذہب نے ایک ایسی حدیث ابوبکر قطیعی سے روایت کی جس کو ان سے ہرگز نہیں سنا تھا"

اس پر ذہبی نے ابن المذہب کی طرف سے یہ تاویل کی ہے کہ شاید وجادۃً اجازت بنا لی ہو۔ (یعنی وہ حدیث کہیں قطیعی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہو، یا کسی اور جگہ قطیعی کی طرف منسوب نظر آئی ہو اور انھوں نے اسی پا لینے کو اجازت قرار دے دی ہو اور حدثنا ابوبکر القطیعی کہہ کر روایت کرنے لگے ہوں) تو کیا یہ بھی جھوٹ نہ ہوا؟

پھر ابن حجر لکھتے ہیں "خطیب بغدادی نے یہ بھی بیان کیا کہ ابن المذہب نے ہم لوگوں سے بواسطہ دارقطنی و ورّاق ابو عمرو بن مہدی ایک مرتبہ ایک حدیث محاملی سے روایت کی، تو میں نے کہا کہ یہ حدیث تو ابو عمرو بن مہدی کے پاس نہ تھی تو ابن مذہب نے ابن مہدی کے نام پر ہاتھ مار کر کہا کہ بہتیری حدیثیں میرے سامنے پیش کی جاتی ہیں، جن میں نام غیر منسوب ہوتے ہیں تو میں ان کو اپنی طرف سے منسوب کر لیا کرتا ہوں، اس طرح اصل روایت میں وہ نسبت ملحق ہو جایا کرتی ہے۔

اتنا لکھ کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ابن مذہب کے ہم عصر ان کی ان حرکتوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، مگر یہ کبھی ان حرکتوں سے باز نہ آئے[6]"

ان تمام باتوں کو لکھ کر آخیر میں حافظ ابن حجر پھر ذہبی کا آخری قول نقل فرماتے ہیں کہ "ان تمام باتوں سے یہ ضرور ظاہر ہو گیا کہ ابن المذہب ایک غیر متقن آدمی تھے اور انھیں کی طرح ان کے شیخ ابوبکر قطیعی بھی۔ اور اسی وجہ سے مسند میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہو گئیں جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے نہ اسناد ہی۔ واللہ اعلم" (دیکھئے لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۳۷ و میزان الاعتدال جلد اول ص ۲۳۷)

یہی ابن المذہب ہیں جو ابن مالک ابوبکر قطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ہیں ان کے سوا کوئی دوسرا راوی مسند احمد کا دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ بھی تنہا جو روایت کرتے ہیں تو صرف ابن مالک ابوبکر قطیعی ہی سے۔ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور ابن حجر نے لسان المیزان میں جو اتنا ان کے متعلق لکھا ہے وہ بھی مجبوراً۔ اس لئے کہ کہاں تک چھپاتے اور اگر ان کے تمام حالات

---

[1] مسند کے موجودہ مطبوعہ مصری نسخے میں یہاں بجائے عبدالواحد کی جگہ عبدالوہاب لکھا ہوا ہے مگر جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے صحیح عبدالواحد ہی ہے۔

[2] اگر ذہبی یا ابن حجر اتنا نہ لکھیں اور اس سماعت کی صحت تسلیم نہ کریں تو پھر مسند احمد کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے اس لئے اتنا اعتراف مجبوراً ضروری تھا۔ اس کے بعد مگر پوری کتاب کا نہیں یہ فقرہ بے لوث حق گوئی ثابت کرنے کیلئے لکھ دینا لازمی تھا۔

[3] اس کا اصل نسخہ دنیا میں کہیں نہ تھا۔ یہ پوری کتاب مجرد ابن المذہب یا ان کے رفقاء کی تصنیف کردہ تھی جسکو انھوں نے اپنے ہاتھ لکھ کر امام کی طرف سے منسوب کر رکھا تھا۔ ابن حجر فرماتے ہیں "اس لئے وہ محل حجت نہیں" تو پھر اور کس کی روایت سے کتاب الزہد محل حجت ہو سکے گی؟ دنیا میں ہے کوئی؟ جو ابن المذہب کے علاوہ کسی اور کی روایت سے کتاب الزہد کو پیش کر سکے

[4] حرانی سے مراد ابو شیبہ عبداللہ بن الحسن الحرانی کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خود ابن حجر و ذہبی کی تصریحات سے ثابت ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کا لقب پایا ہو جس کو کہا جا سکے کہ شاگرد ہو۔ تفصیل دیکھئے۔

[5] کتاب الزہد کا وجود ہی پہلے کہاں تھا کہ معدوم ہوتی؟ اس کو تو نہاں خانہ عدم سے ساحت وجود پر خبیرا ابن المذہب ہی پہلے پہل لایا۔ اگر اس کو اپنے نام پیش کرتا تو مانتا ہی کون؟ اسلئے بیچارے نے اس کو امام احمد کی طرف منسوب کر دیا۔ ذرا سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا! ورنہ امام احمد یا ان کی تصنیف ان کی تلامذہ نے ایسی بے اعتنائی کیوں برتی؟ اور یہ چیز معدوم کیوں اور کس طرح ہو گئی؟

[6] یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ابن المذہب مسند احمد اور کتاب الزہد کو ڈھونڈے ڈھونڈے پھرا مگر بجز ابوالقاسم ہبۃ اللہ کے ان کو اور کوئی ایسا نہ ملا جو ان سے مسند احمد یا کتاب الزہد کی سند لیتا۔ بادی النظر جس نے بھی الٹ پلٹ کر دیکھا، چیز اچھی نظر آئی، اسلئے امام احمد کی نسبت کا اتنا ہی احترام کیا تو بہت کیا کہ ان کو زبان سے جھٹلایا نہیں مگر ہر شخص دل میں ضرور ان کتابوں کی طرف سے غیر مطمئن رہا، ورنہ کچھ بھی وثوق اگر ہوتا تو خود خطیب بغدادی اور ان کے دوسرے ہم عصر مسند احمد اور کتاب الزہد کی سند ان سے ضرور لیتے۔ امام احمد کی کتابیں ایسی نہیں ہو سکتیں کہ خطیب جیسے محدثوں کے رسیا ان کی طرف سے بے اعتنائی اور بے پرواہی برتیں

واضح کر دیتے تو پھر مسند احمد کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

ابھی ابھی ابن المذہب کے آغاز کا تذکرہ میں آپ نے پڑھا کہ "ابن المذہب کے نسخہ مسند احمد میں مسند جابر کی وہ بعض حدیثیں نہیں ہیں جن کو حرانی نے قطیعی سے روایت کیا ہے۔" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر قطیعی سے حرانی (یعنی ابوشعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی) نے بھی مسند احمد کی روایت ہے، تو قطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ابن المذہب نہ ہوئے، بلکہ دوسرے راوی حرانی بھی ہیں[1] مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس طرح کی داؤ گھات چالاک محدثین کو خوب آتی ہے کہ بعض غلط باتیں ضمنی طور سے کسی دوسرے تذکرے میں کہہ جاتے ہیں؛ تاکہ خارج از بحث بات ہونے کی وجہ سے اس غلط بات کی تغلیط کی طرف کوئی توجہ نہ کرے اور اس طرح وہی غلط آئندہ کے لئے صحیح بن جائے۔ بعد کو یہی بات جو اس وقت خارج از مبحث ہے، خود موضوع بحث بنائی جائے گی، تو یہ تحریر اس وقت ثبوت میں پیش کر دی جائے گی کہ فلاں جگہ اس کا ذکر آ چکا ہے اگر یہ بات غلط ہوتی تو اسی وقت اس کی تردید کی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حرانی[2] کا ابوبکر قطیعی سے پوری مسند احمد یا اس کے کسی جزء کا بھی بلکہ کسی حدیث کا بھی روایت کرنا کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ خود ابن حجر لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۱۰۲ میں حرانی کا ترجمہ لکھتے ہیں، مگر ان کے شیوخ میں ابوبکر قطیعی کا نام نہیں لکھتے اور نہ مسند احمد ہی کی روایت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی امید بھی نہیں کی جا سکتی کہ ایک تقریباً نوے برس کا بوڑھا آدمی ایک بائیس برس کے لڑکے سے مسند احمد کی سماعت کرنے جائے وہ دو چار حدیثیں نہیں بلکہ تقریباً ساٹھ ہزار حدیثیں۔ اگر کہا جائے کہ جس سال حرانی جنت کو سدھارے اسی سال نہیں، بلکہ اس سے چند سال پیشتر ان کی اتنی ہمت شاید ہو گئی ہو، تو چند سال پیشتر تو قطیعی صاحب اور بھی زیادہ ہی کم سن اور نوعمر ہوں گے اور پھر حرانی نے تو عبداللہ بن احمد کا وقت قطیعی سے کہیں زیادہ پایا، بلکہ خاص امام احمد یا عبداللہ ہی سے مسند احمد کی سند لینے میں کیا دشواری تھی جو ایک کم سن لڑکے غیر متقن سے مسند کی سند لیتے؟

مگر ابوبکر قطیعی تو حرانی کی وفات کے وقت سے زیادہ سے زیادہ بائیس ہی سال کے ہو سکتے ہیں کیونکہ قطیعی کی ولادت ۲۷۴ھ کی ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔ تو اگر خود قطیعی حرانی سے کچھ حدیثیں روایت کرتے، جب بھی شبہ ہوتا کہ انھوں[3] نے تو حرانی کے اختلاط حواس کا زمانہ دیکھا، ان کی سماع صحیح ہے یا نہیں۔ نہ کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ حرانی نے اس کبر سنی میں ایک نوجوان سے دو چار حدیث نہیں بلکہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ جا کر اول سے آخر تک سنا، یا سنایا اور بالفرض ایسا تھا تو پھر حرانی کے ترجمے میں ابن حجر یا امام ذہبی نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ انھوں نے قطیعی سے مسند احمد کی اس بڑھاپے میں سند لی، یا یہ قطیعی سے مسند کی روایت کرتے ہیں۔ پھر ابن سمعانی نے بھی اپنی کتاب الانساب میں حرانی کا ترجمہ لکھا ہے، وہ بھی نہیں لکھتے کہ مسند احمد کی یہ قطیعی یا کسی سے بھی روایت کرتے ہیں یا قطیعی سے کوئی حدیث بھی سنی۔ غرض حرانی کا مسند احمد سے دراصل کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ مسند احمد سے بالکل اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح محدثین جو قطیعی سے متقدم تھے، مسند سے بے خبر تھے، اس لئے کہ قطیعی کی ولادت سے پہلے مسند احمد کا دنیا میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

ابوبکر قطیعی

احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک بن شبیب ابوبکر القطیعی ۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۸ھ میں وفات پائی چونکہ یہی مسند احمد کے تنہا راوی ہیں، اس لئے اگر ان کی توثیق نہ کی جاتی تو پھر یہ ذخیرۂ روایات کہیں کا بھی نہ رہتا، اس لئے امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد اول ص۴۱ میں ان کے ترجمے کے ضمن میں اتنا تو اعتراف کیا ہے کہ "ابن الفوارس ان کو حدیث میں کچھ یونہی سا سمجھتے تھے اور مسند احمد کے بارے میں ان کے بعض[4] اصول محل نظر ہیں اور برقانی نے کہا کہ ان کی کتاب کا کچھ حصہ غرق ہو گیا تھا، تو ایک دوسری[5] کتاب جس کے متعلق ان کی سماع نہ تھی، اس سے انھوں نے حدیثیں نقل کر لیں، اس وجہ[6] سے محدثین کی ان پر چشمکیں تھیں۔" اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ "ورنہ (یعنی اگر یہ باتیں نہ ہوتیں، تو) وہ فی نفسہ ثقہ ہیں" پھر خود لکھتے ہیں کہ "میں خود ان سے سخت متنفر اور بعید خفا تھا مگر مجھے[7] معلوم ہو گیا نہیں یہ سچے آدمی ہیں، ان کی سماع میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ اور میں نے سنا ہے کہ وہ مجاب الدعوۃ بھی تھے"[8] ان کی توثیق کی اتنی کوشش صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے ہے، چنانچہ ابن حجر امام ذہبی کی اتنی عبارت نقل کر کے لسان المیزان جلد ۱ ص۱۴۵ میں لکھتے ہیں کہ "ذہبی نے جو ابن فرات (کی صحت) پر انکار کیا ہے اس سے تعجب ہے۔ کیونکہ ابن فرات ہی کچھ اس درجہ میں متفرد نہیں ہیں بلکہ خطیب نے بھی اس کو محمد بن محمد السیبی کے ترجمے میں لکھا ہے۔ پھر آگے چل کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ "اور ذہبی سے تعجب ہے کہ ابن الفرات کے قول کی تو یہاں تردید کرتے ہیں مگر (انھیں قطیعی کے شاگرد خاص) حسن بن علی التمیمی (ابن المذہب) کے ترجمے کے آخر میں خود لکھتے ہیں (یعنی وہ جو ہم نے ابن المذہب کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ابن حجر نے ابن المذہب کے متعلق امام ذہبی کا قول نقل کیا ہے) کہ "یہ بات ظاہر ہے کہ ابن المذہب ایک غیر متقن شیخ تھے، اور انھیں کی طرح ان کے شیخ ابن مالک (القطیعی) بھی اور اسی وجہ سے مسند احمد میں ایسی چیزیں واقع ہو گئی ہیں جن کی نہ متن ہی درست ہے نہ اسناد ہی واللہ اعلم۔"

غرض ذہبی اور ذہبی سے زیادہ ابن حجر، قطیعی سے بالکل مطمئن نہیں ہیں مگر دونوں ہی مسند کی وجہ سے مجبور ہیں۔ اس لئے باوجود دلی تنفر کے کسی نہ کسی حد تک قطیعی کی توثیق ضرور کئے جاتے ہیں تاکہ مسند احمد کا بھرم رہ جائے۔ اگر مسند کا خیال نہ ہوتا، تو خدا جانے یہ لوگ قطیعی اور ابن المذہب دونوں کے متعلق کیا کیا لکھتے۔

قطیعی کے شیوخ دراصل قطیعی کے شیوخ نہ تھے

قطیعی کے شیوخ میں عبداللہ بن احمد کے سوا تین چار امام ذہبی ائمہ رجال نے لکھے ہیں جن میں اکثریت وضاعین وکذابین ہی کی ہے۔ مثلاً محمد بن یونس السامی، الکدیمی وغیرہ مگر تعجب یہ ہے کہ جہاں ان لوگوں کے تلامذہ کی فہرست ہے، وہاں قطیعی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ قطیعی کی اتنی عمر ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں سے یہ حدیثیں سنیں، اور روایتیں اخذ کر سکیں۔ البتہ قطیعی کے حقیقی استاد اور رفیق مذہب مسلک ابوبکر شافعی کا نام ان لوگوں کے تلامذہ میں آتا ہے، جس طرح عبداللہ بن احمد کے ساتھ بھی دراصل ابوبکر شافعی ہی رہے اور ان کے ساتھ بچوں کی طرح یہ قطیعی صاحب بھی لگے لپٹے رہتے تھے ان کو جو کچھ بھی ملا۔ ابوبکر شافعی ہی سے ملا مگر یہ درمیان سے ابوبکر شافعی کا نام اڑا کر اپنی نسبت کو بلاواسطہ ابوبکر شافعی کے شیوخ سے جوڑ دیا کرتے تھے، اسی

---

[1] تعجب ہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر دونوں ہی ابن المذہب کو مسند احمد کا ابوبکر قطیعی سے تنہا راوی بھی لکھتے ہیں پھر حرانی کو قطیعی سے مسند احمد کا راوی بتاتے ہیں، اگر دونوں قطیعی سے مسند کی روایت کرتے تھے تو پھر ابن المذہب تنہا راوی کس طرح ہوئے؟

[2] ابوشعیب الحرانی کے متعلق ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ یہ ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۹۵ھ میں ۸۹ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس حساب سے ان کی عمر ۸۹ کی نہیں ہوتی، بلکہ اس حساب سے ان کی عمر ۹۳ سال کی ہو جاتی ہے۔ ابن حجر یہ بھی لکھتے ہیں کہ احمد بن کامل کا قول ہے کہ حرانی نے ۲۹۰ھ میں وفات پائی اس لئے یقیناً سال ولادت ہی غلط ہے۔ غالباً ۲۰۲ھ یا ۲۰۶ھ میں حرانی کی ولادت ہوئی جب ہی ۸۹ سال کی عمر پا کر ۲۹۲ھ یا ۲۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی، مگر بہرحال یہ عبداللہ بن احمد سے عمر میں بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد سے مسند کی روایت کر سکتے تھے اور اگر امام احمد یا عبداللہ کے وقت میں مسند کا وجود ہوتا، تو قطیعی تو کیا حرانی سے بھی زیادہ معتمد علیہ محدثین مسند کی روایت خاص امام احمد اور نیز عبداللہ سے کرنے والے دنیا میں مشہور و معروف ہوتے۔

[3] ابن المذہب کے ترجمے میں ابن حجر لسان المیزان جلد ۲ ص۲۷۴ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ابن المذہب نے ایک اسناد میں قطیعی کے ساتھ ابوسعید الحرقی کا نام بھی لگا کر کہا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے ابوشعیب الحرانی نے حدیث بیان کی الخ۔ اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ قطیعی نے خود حرانی سے حدیث سنی اور روایت لی ہے نہ کہ بالعکس۔ فافہم

[4] امام ذہبی ہوں یا ابن حجر، مسند کے بھرم کو بہرحال برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اسی لئے اس کے خاص اور واحد و تنہا راویوں پر جرح بھی کرتے ہیں تو مسند کو بچاتے ہوئے۔ مسند پر بھی حرف آتا ہے تو کم سے کم اتنی کوشش رہتی ہے کہ اتنا تو ہو کہ مسند بالکل ہی مشتبہ نہ ہو جائے۔ ابن الفوارس کا قول اس طرح نقل کیا ہے جس سے محل نظر پورا مسند ہی نہ ٹھہر جائے، حالانکہ ابن الفوارس پورے مسند ہی کو محل نظر ٹھہراتے ہیں۔

[5] وہ دوسری کتاب کس کے پاس تھی؟ اور جس کے پاس تھی، اس نے کہاں سے حاصل کی تھی؟ اور پھر وہاں صرف ابوبکر قطیعی کو اپنی کتاب درست کر لینے کا موقع ملا اور کسی کو وہاں سے مسند کی اجازت یا نقل کا موقع کیوں نہ مل سکا۔ اور اس شخص نے خود مسند کی روایت کیوں نہ کی۔ اگر عبداللہ بن احمد سے اس کو وہ کتاب ملی تھی۔ تو پھر قطیعی ہی تنہا عبداللہ سے مسند کے راوی نہ ہوئے۔ وہ بھی تو ایک ہوا اور اگر اس کو خود امام احمد ہی سے مسند ملی تھی تب تو بڑی چیز ہوتی۔

[6] محدثین کی چشمکیں تو دراصل اس مسند احمد کے اختراع و اختلاق ہی کی وجہ سے تھیں مگر برقانی نے پردہ ڈالنے کے لئے کچھ حصہ کتاب کے غرق ہو جانے کو چشمک کا سبب قرار دیدیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہمعصروں نے ان سے مسند احمد کے اصل نسخہ کا مطالبہ کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ فلاں سفر میں غرق ہو گیا، تو میں نے اپنی یاد سے اور کچھ ردی پرزے پرچوں سے جو میسر تھا اس سے مرتب کر لیا، اسی لئے ان کے ہمعصروں نے اس مسند کو مشکوک قرار دیا اور ان پر چشمکیں ہونے لگیں۔ اتنے بڑے اہم واقعہ کو برقانی نے کس قدر ہلکا کر کے لکھا، صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے۔

[7] کس ذریعے سے معلوم ہوا؟ اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی، مگر مجھکو وہ ذریعہ معلوم ہے، یعنی یہی کہ دوسرے ہم عصر محدثین نے کہا کہ اگر ان کی سماع کو معتبر نہیں مان لیتے ہیں تو پھر مسند احمد جیسا ذخیرہ ثابت نا ہوا جاتا ہے۔ اس لئے جس طرح ہم لوگوں نے ان کی سماع صحیح مان لی ہے آپ بھی مان لیجئے اور اس تنفر و خفگی کو دور کیجئے اور پھر مسند کے پروپیگنڈا کرنے والوں نے قطیعی کے ولی اور مجاب الدعوات ہونے کا بھی پروپیگنڈا کر رکھا تھا

[8] میزان الاعتدال جلد ۱ ص۴۲

لئے ان کے اکثر شیوخ ایسے ہی ہیں جو ان کے کم سنی یا آغاز شباب ہی کے وقت دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ غرض یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ دراصل قطیعی کے استاد و شیخ جو کچھ بھی تھے، حضرت ابوبکر شافعی ہی تھے اور کوئی بھی نہیں۔ نہ عبداللہ بن احمد نہ کوئی اور۔ جس کی تصریح آگے ابوبکر شافعی کے ترجمے میں آتی ہے۔ سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ابھی عبداللہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

عبداللہ بن امام احمد بن حنبل

ان کی ولادت ۲۱۳ھ کی ہے اور ۲۹۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ حضرت امام احمد کی وفات ۲۴۱ھ میں ۱۲ ربیع الاول کو ہے۔ یعنی تقریباً آغاز سال ہی میں۔ اور عبداللہ کی پیدائش ۲۱۳ھ کے وسط میں ہے اس لئے امام احمد کی وفات کے وقت عبداللہ زیادہ سے زیادہ ۲۸ برس کے تھے۔ اور ابوبکر قطیعی کی عمر عبداللہ کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۷ برس کی ہوتی ہے اس لئے پتہ مل سکتا ہے کہ یہ چند سال عبداللہ بن امام احمد کی خدمت میں شاید رہے ہوں، مگر اس عمر میں ساٹھ ہزار حدیثوں کے مکمل مجموعہ کا سننا اور اخذ کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔ کوئی صاحب انصاف اسکو تسلیم نہیں کر سکتا۔

قطیعی دراصل ابوبکر شافعی کے چیلے تھے

البتہ یہ بچپن ہی سے ابوبکر شافعی کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ ابوبکر شافعی، عبداللہ ابن احمد کے شاگردوں کی جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔ عبداللہ اور ابوبکر شافعی کی وفات کے بعد یہ بلاشبہ خود عبداللہ بن احمد سے تلمذ کے مدعی ہو گئے۔ اس لئے لوگوں نے ابوبکر شافعی کے ساتھ ان کو بھی عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں شمار کر لیا۔ اس وقت مسند احمد کا کوئی وجود تو تھا نہیں کہ واقعی مسند احمد کو کوئی سنتا، یا ان کو سناتا اور لوگ یہ خیال کرتے کہ ان کی عمر عبداللہ کے وقت میں آتنی تھی یا نہیں کہ ساٹھ ہزار روایات کا مجموعہ۔

قطیعی نے عبداللہ بن احمد کا وقت پایا

یہ عبداللہ سے اخذ کر سکیں۔ ان کے ادعائے تلمذ سے ابتدا میں لوگ اسی قدر سمجھے کہ حدیثیں شاید آخر وقت میں عبداللہ بن احمد سے سنی ہونگی، اس وجہ سے یہ تلمذ کا دعویٰ کر رہے ہیں کسی کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اتنی سی بات کو جھٹلاتا جس کے امکان کی گنجائش بھی موجود تھا۔ ہاں اگر یہ عبداللہ بن احمد کے مشہور تلامذہ کے سامنے مسند احمد کا نام لیتے، جب البتہ اکابر محدثین ان کی خبر لینے کو تیار ہو جاتے اور پوچھتے کہ مسند احمد کس جانور کا نام ہے اور تم کہاں سے لائے؟ ہم لوگوں کو تو نعمت عظمیٰ عبداللہ سے نہ ملے جو برسوں عبداللہ کی خدمت میں رہے اور ساری زندگی حدیث کی خدمت میں گزاری اور گزار رہے ہیں اور تم کو ہم سب لوگوں سے چھپا کر بلا کسی استحقاق کے عبداللہ بن احمد نے اتنی بڑی دولت چپ چاپ سونپ دی! آخر تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔

یہ مسند احمد کب اور کس طرح وجود میں آئی۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ خاص مسند احمد کے ذکر میں۔ ابھی سلسلے کی آخری کڑی یعنی امام احمد بن حنبل کا مختصر ترجمہ سن لیجئے۔

امام احمد بن محمد بن حنبل

ان کی ولادت ۱۶۴ھ میں اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی ۷۷ سال کی عمر پائی۔ امام شافعی، ابن مہدی، ابوالولید، عبدالرزاق، وکیع، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون سے یہ خود بھی روایت کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی ان سے روایت کرتے ہیں یعنی یہ سات آدمی ان کے شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی اور قتیبہ، داؤد بن عمرو اور خلف بن ہشام ان سے عمر میں بڑے تھے، مگر ان کے تلامذہ میں تھے اور احمد بن الحواری، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، حسین بن منصور، زیاد بن ایوب، ابو قدامۃ السرخسی، محمد بن رافع، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور عبدالرحمٰن بن ابراہیم جن کا لقب "دحیم" تھا یہ نو آدمی ان کے اقران میں سے اور ان کے خاص شاگرد اور خود بلند پایہ محدثین گنے جاتے تھے اور عبداللہ اور صالح ان کے دونوں صاحبزادے بھی ان کے خاص شاگرد تھے۔ ان اکابر محدثین کے علاوہ ابوبکر الاثرم، بقی بن مخلد، حرب الکرمانی، حنبل بن اسحٰق، شاہین بن سمیدع اور میمون بھی ان کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ پھر امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد بذات خود بلا واسطہ بھی ان سے روایت کرتے ہیں اور بواسطہ ابو عبدالرحمٰن اسود بن عامر الشافعی ملقب بہ شاذان بھی امام احمد کے آخری شاگرد، جو امام احمد کے بعد عبداللہ بن احمد کے بھی شاگرد ہوئے۔ مشہور محدث ابو القاسم البغوی ہیں اور ان بزرگواروں کے علاوہ ایک جماعت کثیر امام احمد کے تلامذہ میں ہے۔ جن میں سے بہتیروں کے نام تہذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال میں مذکور ہیں۔

سلسلۂ اسناد کے تمام افراد کو جان لینے کے بعد اب خاص مسند احمد کے وجود اور اس کی توعیتوں پر غور فرمائیے۔

مسند احمد

اب یہ چیز ہر صاحب عقل بغیر ذہن پر زور ڈالے سمجھ سکتا ہے کہ اگر امام احمد بن حنبل اپنی زندگی میں کوئی مجموعہ اپنی حدیثوں کا قلم بند کر جاتے یا اپنے صاحبزادے سے لکھواتے تو جس طرح امام مالک سے ان کی مؤطا ان کے سینکڑوں شاگردوں نے سنی، اور ہر سننے والا ان سے مؤطا کی روایت کرتا تھا اسی طرح امام احمد کے مسند کو بھی عبداللہ کے علاوہ ان کے دوسرے تلامذہ بھی ضرور امام احمد سے سنتے اور اس کی روایت کرتے اتنے بڑے بڑے محدثین، جو نہ صرف امام احمد کے شاگرد تھے، بلکہ استاد بھی تھے، یا خاص اقران میں تھے یا عمر میں بڑے تھے، یا اپنے علم و فضل کی وجہ سے علم حدیث میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب امام احمد کے شاگرد تھے، آخر یہ سارے کے سارے اس مسند ضخیم کے وجود سے بالکل بے خبر کیوں رہے اور امام احمد نے ان سب کے سب سے اپنی اس کتاب کو پوشیدہ کیوں رکھا؟ یہاں تک کہ اپنے دوسرے بیٹے صالح کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم ہی رکھا! تعجب ہے کہ امام بخاری اپنی تاریخ میں امام احمد کا ذکر خیر کرتے ہیں، مگر نہ مسند کا کوئی ذکر فرماتے ہیں نہ کتاب الزہد کا۔ آخر امام احمد کو کیا ہو گیا تھا کہ اشاعت حدیث و اشاعت دین کے عوض اپنے تمام شاگردوں سے بالکل کتمان حدیث و کتمان علم فرمایا اور صرف اپنے ایک ہی صاحبزادے عبداللہ کو اس کتاب مکنون کا محرم راز بنایا؟ آخر دوسرے لوگوں سے اس اخفاء و کتمان کی کیا ضرورت پڑی؟ کیا ان کے تلامذہ میں سے عبداللہ کے سوا کوئی بھی اس امانت عظمیٰ کا امین نہیں ہو سکتا تھا؟

عبداللہ کے تلامذہ ابوالقاسم البغوی

اسی طرح عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابوالقاسم البغوی جن کی ولادت ۲۱۳ھ کی ہے یعنی عبداللہ سے ایک سال بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد کے آخری شاگرد تھے یعنی عبداللہ کے خواجہ تاش استاد بھائی۔ اور خود مشہور بلند پایہ محدث تھے ۳۱۷ھ میں عبداللہ بن احمد کے ستائیس سال بعد وفات پائی۔

سلیمان بن احمد الطبرانی

سلیمان بن ایوب اللخمی الطبرانی جن کی ولادت ۲۶۰ھ کی اور وفات ۳۶۰ھ میں ہے۔ پورے سو برس کی عمر پائی۔ عبداللہ کی وفات کے وقت تیس برس کے تھے۔ اور قطیعی سے تیرہ سال بڑے تھے اور بقول ابن حجر ۱۳ سال کی عمر سے حدیثیں سننے لگے اور برابر عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگے رہے۔

احمد بن کامل بن شجرہ

احمد بن کامل بن شجرہ القاضی البغدادی، ان کی ولادت بھی ۲۶۰ھ ہی کی ہے۔ نوے سال کی عمر پاکر ۳۵۰ھ میں راہی جنت ہوئے ابن حجر نے ان کو کان من اوعیۃ العلم (علم کا ظرف) لکھا ہے۔

محمد بن مخلد

محمد بن مخلد بن حفص جنہوں نے کافی عمر پاکر ۳۳۱ھ میں وفات پائی، دارقطنی جیسے مشہور محدث کے شیوخ میں تھے اور قطیعی سے کافی بڑے تھے، عمر میں بھی اور علم و فضل میں بھی۔ ابن حجر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم تھے وغیرہم۔

غرض ایسے ایسے تلامذہ کے ہوتے عبداللہ بن احمد کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ ایسی کتاب مکنون مسند احمد، جس کو امام احمد نے اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر صرف انھیں کو بطور ایک پوشیدہ راز کے عطا فرمایا تھا۔ ایسی نعمت عظمیٰ کو انھوں نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر بلا استحقاق دیا بھی تو صرف ایک سترہ سال کے لڑکے ابوبکر قطیعی کو!

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

جس طرح امام احمد نے اپنے دوسرے تمام تلامذہ حتیٰ کہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی اس مسند کو پوشیدہ رکھا بالکل اسی طرح عبداللہ نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے اس باپ کی دی ہوئی نعمت کو پوشیدہ ہی رکھا اور ایک گھر سے باہر کے کم عمر لڑکے کے حوالے کر دیا!

امام احمد کو شاید اولاد کی محبت نے اس رازداری پر مجبور کر دیا ہو اور دوسرے بیٹے سے شاید وہ کچھ خفا سے رہتے ہوں، اس لئے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف ایک ہی بیٹے کو دے گئے اور دوسرے کو بالکل محروم کر دیا مگر یہ ابوبکر قطیعی جیسے سترہ سال کے لڑکے سے عبداللہ کو کون سا رشتۂ محبت تھا کہ عبداللہ نے اپنے تمام برابر والے اور علم و فضل میں مستند شاگردوں پر اس لڑکے کو ترجیح دی؟ اور سب کو اس نعمت سے محروم ہی نہیں، بلکہ بالکل بے خبر رکھا کسی سے کہا تک نہیں کہ میرے پاس والد ماجد کی ایک کتاب ہے۔

پھر ابوبکر قطیعی کے تلامذہ میں بھی ابن المذہب کے علاوہ کچھ لوگ مثلاً حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ بن اسحٰق صاحب الحلیۃ اور علی بن المحسن التنوخی العتقی القزوینی وغیرہما بھی تھے، مگر ابن المذہب کے

لے ابوبکر شافعی کا ترجمہ آگے آئیگا۔ ے لم یرحل احمد بن حنبل الا بعد ۱۲ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۱۰ صفحہ ۳۲۶) ے علی بن المحسن العتقی القزوینی کا ترجمہ لسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۲۵۷ میں ہے ۴۴۲ھ میں وفات پائی حافظ تھے

سوا کوئی دوسرا شخص اس سند کی روایت نہیں کرتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

ابن المذہب کے بھی دو چار شاگرد ضرور ہوں گے، مگر ابن المذہب سے بھی صرف ابوالقاسم ہبتہ اللہ ہی تنہا اس کی روایت کرتے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔

اور ابوالقاسم ہبتہ اللہ صاحب کے بعد صرف حنبل بن اسحٰق الرصافی ہی اس کو تمام لئے پھرتے ہیں، یعنی چھٹی پشت سے اس سند کی روایتی نسل کی چھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹنا شروع ہوتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ادھر اُدھر پھیلنے لگتی ہیں، مگر پانچ پشت اوپر تک برابر مکمل رازداری اور پورے اخفا و کتمان کے ساتھ ایک ایک ہی شخص ہر دور میں اس سند کا تنہا راوی چلا آتا ہے۔ اگر کوئی حدیث اس طرح کی ہو جس کا راوی مسلسل ہر عہد میں ایک ایک ہی شخص رہا ہو اور وہ بات ایسی ہو جس کے جاننے والوں کے تعدد کو عقل چاہتی ہو تو ایسی حدیث احاد قرار دے کر ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دے دی جاتی ہے اور یہاں ساٹھ ہزار حدیثوں کا پورا مجموعہ پانچ پانچ دور تک ایک ایک ہی شخص کی وساطت سے چلا آرہا ہے۔ مگر کسی محدث کے منہ میں زبان نہیں کہ اس پورے مجموعے کو احاد کہہ کر ٹھکرا دے۔ خصوصاً جب اس کے دو آخری راوی بالکل مجہول الحال ہیں اور اس کے اوپر کے دو راوی ابن المذہب اور ابوبکر قطیعی غیر مستقین اور ناقابل احتجاج۔ (باقی)

ماہنامہ طلوع اسلام کے
پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۱ء	مئی تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزمہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام — کراچی

مطبوعات طلوع اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیز کاغذ مضبوط و حسین جلد بمعہ گرد پوش ——— قیمت ـ بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات ——— قیمت ——— آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات ——— قیمت ——— دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ——— قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات قیمت ——— چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر سات سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاجِ شناسِ رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول، مزاج شناس کون ہے؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۸ صفحات۔ قیمت ——— چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یک جا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد ——— چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۲ صفحات ——— قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات ——— قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینے میں۔ صفحات ۱۹۲ ——— قیمت دو روپے

نظامِ ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔ قیمت قسم اول ——— چھ روپے قسم دوم ——— (غیر مجلد) ——— چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:- ادارۂ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۴۳۰۴ - کراچی

جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی

حقائق و عبر

زندہ قوموں کے سامنے کیا کیا مسائل ہیں جن کے حل کرنے کے لئے وہ دن رات مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں اور مسلمانوں کے سامنے کون سے مسائل ہیں۔ جن کی حل کی تلاش میں وہ مضطرب و بے قرار رہتے ہیں۔ اور ان کا حل ان کے پیشوایانِ دین بکمالِ عنایت عطا فرماتے ہیں اس کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے لگائیے۔

شب قدر

ذیل کا استفسار اور اس کا جواب صدق (لکھنؤ) کی ۱۵ر جولائی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

"شب قدر" کیا چیز ہے؟

اس کو تلاش کرنے سے کیا مراد ہے؟

اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اور یہ کس طرح دکھائی دیتی ہے؟

اس کو کس طرح تلاش کیا جائے؟

یہ سوالات ہیں جو ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں کوئی کہتا ہے ایک روشنی ہوتی ہے جو بحالت عبادت و ریاضت دکھائی دیتی ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے جتنے واعظ اتنی ہی تاویلیں — ہیں۔ ان سے ذہنی خلجان رفع ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتا ہے — سورۃ انا انزلنا کی تفسیر مولانا محمود الحسن صاحب کے ترجمہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہا اللہ علیہا کے حواشی والے قرآن میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک خاص کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عبادت و ذکر میں کافی رغبت اور دلچسپی سی حاصل ہوتی ہے۔ تفسیر بیان القرآن میں اسی سورہ کے معنی و تفسیر کو دیکھنے سے بھی کوئی گرہ کشائی نہ ہوئی۔

بخاری کی احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معلوم ہوا کہ اس شب ہیں یعنی رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں "شب قدر" دکھائی دیتی ہے کیا چیز ہے جو ان راتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ امید کہ حضور عالی اس کی عقدہ کشائی فرمائیں گے، تاکہ ایک مدت کی یہ الجھن رفع ہو امید کہ رہنمائی فرما کر عزت افزائی فرمائیں گے

نیاز مند

صدق :- شب قدر کا تعلق عالم بالا سے ہے۔ اس کی پوری تفصیلات حدیث میں وارد ہوئیں ہی نہیں (اور جتنی بھی ہیں) ان میں کام کی چیز ہمارے آپ کے لئے بس یہ ہے کہ ان شبوں میں کرنا کیا چاہیئے۔ یہ سال کی ایک بزرگ اور معزز ترین شب ہے (جیسے ہفتہ کا بزرگ دن جمعہ۔ اور سال کا بزرگ مہینہ رمضان ہوتا ہے) حدیث میں اس کا پتہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق تاریخوں میں بتایا گیا ہے جو ۲۱ر ۲۳ر ۲۵ر ۲۷ر ۲۹ر پانچ راتیں ہوتی ہیں۔ اکثر علماء کا رجحان شب ۲۷ر کی جانب ہے۔ مبہم رکھ دینے سے ایک کھلی ہوئی مصلحت شریعت کی یہ معلوم ہوئی کہ پانچوں راتیں (بلکہ عادت پڑ جانے پر پوری دسوں راتیں) عبادت ذکر الٰہی اور اصلاح نفس کی کوششوں میں بسر ہوں یقیناً اس رات میں کچھ خصوصی انوار و تجلیات کا ظہور ہوتا ہوگا اور بعض اہل دل کو کچھ مادی آنکھوں سے بھی نظر آجاتا ہوگا۔ باقی اصل شے یہی ہے کہ اس شب میں بیداری روح و تزکیہ نفس کی زیادہ سے زیادہ تیاریاں کی جائیں اور دعا و ابتہال کا کوئی موقعہ ضائع نہ ہونے دیا جائے۔

طلوع اسلام قرآن نے صرف اتنا کہا ہے کہ لیلۃ القدر وہ رات ہے۔ جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی۔ اور نزولِ قرآن کی ابتدا رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی۔ چونکہ نزولِ قرآن سے دنیا کو نئی اقدار ملی تھیں اس لئے وہ رات جس میں اس کے نزول کا آغاز ہوا — یقیناً لیلۃ القدر تھی۔ اس سے زیادہ قرآن میں اس رات کے متعلق کچھ نہیں۔

مُردوں کو ثواب

ذیل کے سوالات کا جواب رسالہ رضوان کے مطابق حضرت مولانا الحاج علامہ ابوالبرکات سید احمد شاہ صاحب قبلہ ناظم و مفتی مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور نے تحریر فرمایا ہے

سوال ۱۔ فوت شدہ آدمی کی اولاد اگر قرآن مجید یا درود شریف وغیرہ اس کی قبر پر پڑھائیں یا گھر پر پڑھائیں تو کیا ثواب دونوں صورتوں میں مرحوم کو ایک جیسا ملے گا۔ یا فرق ہوگا۔ فرق بیان کیجئے۔

۲۔ کیا مرحوم ان تمام اشخاص کو پہچانتا ہے جو فاتحہ کے لئے اس کی قبر پر جاتے ہیں۔؟

۳۔ اگر موتہ کی اولاد قرآن مجید یا کوئی دینی کتاب کسی کو لے کر دیں تو کیا اس کا ثواب صدقہ جاریہ کے طور پر مرحوم کو ملے گا

۴۔ جو کچھ پڑھ کر موتہ کو بخشا جائے تو کیا اس کا ثواب موتہ کے اعمالنامہ میں درج ہوگا۔ یا قیامت قائم ہونے سے پہلے عذاب قبر کے بچانے کا موجب ہوگا۔

الجواب (۱) قبرستان میں جائے تو الحمد شریف اور الٓمٓ سے مفلحون تک اور آیت الکرسی اور آمن الرسول آخر سورہ تک اور سورہ یٰسین اور تبارک الذی اور الہٰکم التکاثر ایک ایک بار اور قل ہو اللہ بارہ یا گیارہ یا سات یا تین بار پڑھے۔ اور ان سب کا ثواب مُردوں کو پہنچائے۔

حدیث میں ہے جو گیارہ بار قل ہو اللہ شریف پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو پہنچائے تو مردوں کی گنتی کے برابر اسے ثواب ملیگا (در مختار۔ رد المختار)

نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور ہر قسم کی عبادت اور ہر عمل نیک فرض و نفل کا ثواب مُردوں کو پہنچا سکتا ہے۔ ان سب کو پہنچے گا۔ اور اس کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ بلکہ اس کی رحمت سے امید ہے کہ سب کو پورا ملے گا۔ یہ نہیں کہ اسی ثواب کی تقسیم ہو کر ٹکڑا ٹکڑا ملے۔ (رد المختار) بلکہ یہ امید ہے کہ اس ثواب پہنچانے والے کے لئے ان سب کے مجموعہ کے برابر ملے گا مثلاً کوئی نیک کام کیا۔ جس کا ثواب کم از کم دس ملے گا۔ اس نے دس مُردوں کو پہنچایا تو ہر ایک کو دس دس ملیں گے۔ اور اس کو ایک سو دس اور اگر ہزار کو پہنچایا تو اسے دس ہزار دس وعلیٰ ھذا القیاس (فتاویٰ رضویہ)

ثواب فوراً بھی پہنچتا ہے اور قیامت کے دن بھی اجر و ثواب ملے گا۔ اور میت اپنے عزیز و اقارب، دوست و احباب اور زائرین کو پہچانتا اور خوش ہوتا۔ اور ان کے حق میں دعا کرتا اور علیٰ حسب المراتب مدد کرتا ہے

طلوع اسلام قرآن میں ہے کہ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵) ہر شخص اپنے عمل سے جو کچھ کماتا ہے اس کا نتیجہ اس کے اوپر مرتب ہوتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

دوسری جگہ ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا (۴۱/۴۶) جو اعمالِ صالح کرتا ہے وہ بھی اس کی اپنی ذات کے لئے ہوتے ہیں اور جو برے کام کرتا ہے وہ بھی ...... اپنے لئے۔

باقی رہا مُردوں کا اپنے عزیز و اقارب کو پہچاننا اور خوش ہونا سو (عام مُردے تو ایک طرف) قرآن نے ان مُردوں کے متعلق جنہیں لوگ اپنی مرادوں کے لئے پکارتے ہیں فرمایا کہ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۱۶/۲۱) وہ مردہ ہیں۔ زندہ نہیں ہیں۔ اور اتنی بھی خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

عزم الملوک

حکومتوں کی بنیاد عزمِ راسخ پر ہوتی ہے یعنی پیشِ نظر معاملہ کے متعلق بروقت فیصلہ کرنا اور پھر اس فیصلہ پر جمے رہنا۔ عزمیت کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ "عزم الملوک" بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے اس کی وجہ تسمیہ بھی دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ مامون الرشید کو بچپن سے مٹی کھانے کی عادت تھی۔ جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس وقت بھی یہ عادت موجود تھی۔ چنانچہ اس کی کیفیت یہ تھی کہ اگر کبھی عین دربار میں بیٹھے بھی مٹی کھانے کا خیال آگیا تو اسی وقت ایک طرف منہ کر کے چھوٹی سی کنکری منہ میں ڈال لیتا۔ یہ بات ایک بادشاہ کے لئے بڑی معیوب تھی۔ اس سے کئی بار کہا گیا۔ لیکن وہ ہر بار ارادہ کرنے کے باوجود اس پر قائم نہ رہ سکتا۔ ایک دن وزیر نے ذرا ڈانٹ کر کہا کہ آپ اس عادت کو چھوڑتے کیوں نہیں تو اس نے کہا کہ کیا کروں ہزار کوشش کرتا ہوں۔ لیکن پھر اپنے فیصلہ پر قائم نہیں رہ سکتا اس نے کہا کہ "این عزم الملوک" ترے شاہانہ عزم کو کیا ہوا!؟

پرسن کرہاموں سکتہ میں پڑگیا۔ اور کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر کبھی مٹی نہیں کھائی۔

اب دولت خداداد پاکستان کے ارباب حل وعقد کے عزم کی مثال سنیئے۔ اس دفعہ فیصلہ ہوا کہ عیدالضحیٰ اتوار کے دن منائی جائے گی۔ کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہ فیصلہ آخر تک قائم رہا۔ ورنہ یہاں (عیدالفطر کو تو چھوڑیئے) عیدالضحیٰ کے متعلق بھی پورے دس دن فیصلے بدلتے رہا کرتے ہیں۔ بہرحال یہ امر ہزار خوشی کا موجب ہے کہ اس دفعہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن حکومت کے دفاتر میں عید کی تعطیل کے متعلق جو کچھ ہوا۔ وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ پہلے اعلان ہوا کہ چھٹی ہفتہ کے دن کی ہوگی۔ دو دن کے بعد اعلان ہوا کہ نہیں ہفتہ کی چھٹی منسوخ۔ چھٹی سوموار کو ہوگی۔ اس کے دو دن بعد یہ فیصلہ ہوا کہ سابقہ حکم بھی منسوخ۔ چھٹی ہفتہ اور سوموار دونوں دنوں کی ہوگی۔ اور رات یہ اعلان ہو رہا تھا کہ پہلے جو فیصلہ کیا گیا تھا کہ منگل کے دن اختیاری چھٹی ہوگی اب اسے منسوخ کیا جاتا ہے۔ یہ سطور ہفتہ کی صبح کو لکھی جا رہی ہیں۔ اور عید میں ابھی چوبیس گھنٹے باقی ہیں۔ کیا معلوم کل تک کیا تبدیلیاں ہو جائیں!

مقام پست و شکست و فشار و سوز و کشید
میان قطرۂ نیسان و آتش عنبی ! !

غور کیجئے جو لوگ اتنی سی بات کے متعلق فیصلہ نہیں کر پاتے اور فیصلہ کرنے کے بعد اس پر دو دن تک قائم نہیں رہ سکتے وہ سلطنت کے مہمات امور کے متعلق کیا فیصلے کریں گے اور ان پر کیا قائم رہیں گے۔

پھر یہ خبر بھی موجب دلچسپی ہے کہ ڈھاکہ کی رویت ہلال کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ عید ہفتہ کی ہوگی اور کوئٹہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ عید ہفتہ کی ہوگی۔

ہمیں آٹھ برس ہوگئے اتنی سی بات کہلاتے سمجھاتے کہ ان تقاریب کے متعلق مرکزی حکومت کو خود فیصلہ کرنا چاہیئے اور اس طرح سارے ملک میں یکسانیت پیدا کر دینی چاہیئے۔ لیکن یہاں اور کونسی بات سمجھ میں آگئی ہے۔ جو یہ بات سمجھ میں آجاتی؟ ہمارا اوپر کا طبقہ اس دنیا میں رہتا ہے جو عقل کی حدود سے آگے واقع ہوئی ہے۔

مطبوعات طلوع اسلام کی شرائط ایجنسی

شرح کمیشن

معراج انسانیت ۔۔۔ ۲۵ فی صدی۔ دیگر مطبوعات ۳۳ فی صدی (۲) قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائیگی۔ (۳) غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی۔ (۴) پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم کی نہیں ہونی چاہیئے۔ (۵) ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے۔ ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی۔

نوٹ:۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملہ طے کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۔ کراچی

بین الاقوامی جائزہ

چار ہفتوں کی جنیوا کانفرنس نے امن و مصالحت کی خوشگوار فضا پیدا کر دی ہے جنگ کے بعد پہلی دفعہ ان گران اعاظم رجال نے جن کے فیصلوں پر انسان کے مستقبل کا دارومدار ہے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے روسی قائدین کو خاص طور پر قریب سے دیکھنے کی ضرورت تھی کیونکہ سٹالن جیسے مرد آہنی کے انتقال کے بعد یہ جاننا ضروری تھا کہ جو قائدین ان کے بعد ابھرے ہیں ان کی پوزیشن کیا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چار بڑوں میں باہمی اعتماد کی ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جو متنازعہ فیہ مسائل کے تصفیہ میں ممد ہوگی۔ اس کانفرنس کا یہ بھی فائدہ ہوا ہے کہ جنگ کو خارج از بحث سمجھ لینے کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایٹمی آلات کے استعمال کو ناگزیر نہیں سمجھا جائے گا صدر آئزن ہاور نے بجا طور پر کہا ہے کہ دنیا میں "ایک نئی دوستی" کا آغاز ہو گیا ہے۔ لیکن یہ دوستی دنیا کے لئے کیا رنگ لائیگی اس کا انحصار وزرائے خارجہ کی کانفرنس پر ہے جو اکتوبر میں شروع ہوگی۔

اس فضا کا اثر چاردانگ عالم میں ظاہر ہو رہا ہے وزیر اعظم برطانیہ نے اعلان کیا ہے کہ مارشل بلگانن اور کروشیف نے برطانیہ آنے کی دعوت منظور کر لی ہے۔ وہ نئے سال کے آغاز میں وہاں جانے کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ شاید فرانس بھی جائیں۔ یہ آمد و رفت اپنی جگہ بڑی دقیع ہے اور جنیوا کی پیدا کردہ فضا کا نتیجہ بھی ہے اور اسے تقویت دینے کا باعث بھی ہوگی۔

اس کا غالباً سب سے زیادہ قابل ذکر نتیجہ یہ اعلان ہے کہ امریکہ اور سرخ چین کے سفیر جنیوا میں یکم اگست کو ملاقات کرینگے یہ ملاقات ان عالمی کوششوں کا نتیجہ ہے جو فارموسا سے متعلق جنگ کا خطرہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ ان میں پیش پیش برطانیہ تھا۔ اس کے وزیر اعظم نے انتہائی کوشش کی کہ جنگ کا خطرہ ٹل جائے اور امریکہ چین سے مذاکرات پر آمادہ ہو جائے لیکن ایسی صورت ممکن نہ ہو سکی کیونکہ جہاں چین کی کوشش تھی کہ فارموسا کے نمائندے شریک مذاکرات نہ ہوں وہاں امریکہ انھیں ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ بڑی تگ و دو کے بعد بالآخر براہ راست مذاکرات کی شکل نکل آئی ہے۔ یہ جنیوا کانفرنس کا ہی نتیجہ ہے۔ صدر آئزن ہاور نے کہا ہے کہ اگر ضرورت ہوئی تو اس سفارتی ملاقات کو وزارتی ملاقات میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ پوری سنجیدگی سے اس ملاقات کو آزمانا چاہتا ہے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ پہلے اعلان میں تو بتایا گیا تھا کہ ملاقات کا موضوع ایک تو ان ۱۵ امریکیوں کی رہائی ہے جو چین کی قید میں ہیں دوسرے "کچھ دیگر سیاسی امور" بھی زیر بحث آئیں گے۔ بعد میں ان کے متعلق صراحت کر دی گئی ہے کہ فارموسا کو بھی زیر بحث لایا جائیگا۔

جنیوا میں مشرق بعید پر زیادہ تفصیل سے گفتگو نہیں کی گئی تھی اور فیصلوں کا مدار یورپ تھا۔ اب اس کانفرنس کو جنیوا کا ضمیمہ کہا جا سکتا ہے۔ جس میں پورا مشرق بعید آجائیگا۔ اس لحاظ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ معاملہ ۱۵ امریکیوں یا فارموسا تک محدود رہیگا۔ چین نے تو ابھی سے اپنے عزائم کا اظہار کر دیا ہے۔ ایک تقریر میں چینی وزیر اعظم چو این لائی نے تجویز پیش کی ہے کہ جس طرح چار بڑے یورپ کے ایک اجتماعی دفاع کی تجویز پر غور کر رہے ہیں۔ اسی طرح چین تیار ہے کہ مشرق بعید میں ایک اجتماعی دفاعی معاہدہ مرتب کر لیا جائے۔ یہ تجویز بڑی اہم ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ امریکہ اسے بآسانی زیر بحث لانے پر تیار ہو جائیگا۔ کیونکہ اس نے چین کو تسلیم نہیں کیا ہے اور جب تک وہ اس حکومت کو تسلیم نہیں کرتا اس سے دفاعی معاہدہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے امریکہ مشرق بعید میں جو کچھ کر رہا ہے وہ اشتراکی چین کی روک تھام کے لئے ہی کر رہا ہے۔ اس لئے اگر وہ چین سے دفاعی معاہدہ کی گفتگو شروع کرے تو اس کے دفاعی انتظامات پر اثر پڑے گا۔ یہ ملحوظات اپنی جگہ پر درست لیکن مشرق بعید کے تنازعات کے حل کی صورت یہی نظر آتی ہے کہ امریکہ اور چین میں کوئی مفاہمت ہو جائے۔

کشمیر میں ٹال مٹول سے کام لینے والا ہندوستان گوا کے معاملہ میں الجھ سا گیا ہے کیونکہ پرتگال کے رویہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی اور وہ اپنے موقف پر اس حد تک اڑا ہوا ہے کہ وہ گوا کا تحفہ پنڈت نہرو کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پنڈت نہرو ماسکو اور یورپ اور برطانیہ کا دورہ کر کے ہوا کے گھوڑے پر سوار دہلی پہنچے تو ان کی انانیت کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا کہ پرتگال گوا کے معاملہ پر اڑا ہوا ہے چنانچہ انھوں نے آپے سے باہر ہو کر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر پرتگال کی حکومت اپنی ضد پر قائم رہی تو اس کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ بین الاقوامی سیاست میں بات چیت کرنے کا یہ انداز بالکل نرالا ہے اور ایسا ہے جس کی تمام مہذب حکومتیں مذمت کرینگی۔ لیکن اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو کیسی اندرونی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے ایک تازہ تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ وہ عدم تشدد پر کاربند نہیں رہیں گے حالانکہ اس سے پہلے وہ عدم تشدد کا ہی ذکر کرتے رہے ہیں۔ بہرحال گفتگو میں بداعتدالی کے باوجود گوا میں انھیں اعتدال سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ کانگریس پارٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ گوا پر عمومی چڑھائی نہ کی جائے۔ یہ فیصلہ احزاب مخالف کے اس مطالبہ کا جواب ہے کہ گوا پر چڑھائی کر دی جائے اور ہزاروں کی تعداد میں رضا کار بھیجنے شروع کر دیئے جائیں۔

پنڈت نہرو نے ہندوستانی پارلیمان میں یہ اعلان کیا ہے کہ انھوں نے پرتگال کو کہہ دیا ہے کہ وہ اپنا سفارت خانہ دہلی میں بند کر دے۔ واضح رہے کہ لزبن میں ہندوستانی سفارت خانہ گذشتہ سال بند کر دیا گیا تھا۔ گو اس فیصلے کو مکمل سفارتی انقطاع

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

عالمِ اسلامی

مراقش میں قوم پرستوں اور فرانس میں بدستور ہنگامے ہو رہے ہیں۔ اور ان کے تھمنے یا ختم ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دیکھا جائے تو اس کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ فرانس بربریت سے باز آجائے اور الجزائر اور مراقش کو کم از کم خود مختاری ضرور دے دے۔ لیکن فرانس کی ذہنیت میں ایسی خوشگوار تبدیلی کے آثار ابھی تک دکھائی نہیں دیئے۔ اگر فرانس خود ظلم و تعدی سے دست کش نہیں ہوتا تو دیگر اقوام بھی اس کے ہاتھ روکنے میں چنداں دلچسپی نہیں لے رہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مغرب اقصیٰ کی جنگ آزادی جو ایک خالصتاً انسانی مسئلہ ہے باشندگان مغرب اقصیٰ ہی کا مسئلہ بن کے رہ گیا ہے۔ غنیمت ہے کہ ایشیائی افریقی گروہ نے پھر سے معاملہ ہاتھ میں لے لیا ہے۔ وہ پھر کوشش کر رہے ہیں کہ یہ معاملہ پھر اقوام متحدہ میں پیش ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے سلامتی کونسل کے نام ایک یادداشت بھیجی ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی توجہات مراقش کی طرف منعطف کرے جہاں عرصہ دو ہفتوں سے فسادات ہو رہے ہیں۔ اور ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس سے بین الاقوامی کشیدگی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس یادداشت میں سلامتی کونسل کی توجہ مراقش کی طرف مبذول کرائی گئی ہے لیکن اس پر بحث کرنے کے لئے اجلاس منعقد کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اس گروہ نے جنرل اسمبلی سے درخواست کی ہے کہ وہ ۲۰ر ستمبر سے شروع ہونے والے سالانہ اجلاس میں مراقش اور الجزائر پر پوری طرح بحث کا موقعہ دے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک قابل تعریف کوشش ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس سے پیشتر اس قسم کی سعی کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ مراقش کا معاملہ کافی عرصہ سے اقوام متحدہ کے روبرو ہے۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نہ اقوام متحدہ نے اپنی نگرانی میں فریقین کے مابین مذاکرات کرائے اور نہ فرانسیسی تشدد کا دور دورہ ختم کرانے کی کوئی کوشش کی۔ ان حالات میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ جنرل اسمبلی کوئی قابل قدر اقدام کرسکیگی لیکن ایشیائی افریقی گروہ بالخصوص مسلمان ممالک کے لئے یہ سوچنے کا مقام ہے کہ انہیں ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جس سے فرانس کا ہاتھ روکا جاسکے اور اسے مجبور کیا جاسکے کہ وہ مراقش اور الجزائر کے نمائندوں سے مذاکرات شروع کردے۔ اور انہیں کم سے کم وقت میں خود مختاری دے۔ یہ مقصد اقوام متحدہ کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ مستعدی اور ہوشیاری سے کام لیا جائے۔ ایشیائی افریقی گروہ بین الاقوامی سیاست میں بہتر پوزیشن حاصل کرتا جارہا ہے لیکن افسوس ہے کہ اصحاب غرض نے اس کی توجہات کو حقیقی مسائل سے ہٹا کر غیر ضروری امور میں الجھا دیا ہے۔ مغرب اقصیٰ کی آزادی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے پرامن حل کے لئے اس گروہ کو سرتوڑ کوشش کرنی چاہیئے۔

مسلمانوں کی توجہات کو بالخصوص غیر ضروری امور میں الجھایا جارہا ہے۔ انہی دنوں صدر انڈونیشیا سوئیکارنو حج سے پہلے قاہرہ گئے۔ ان کے چند روزہ دورہ کے بعد جو اطلاعات متفرق ذرائع سے مصر سے آئی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دورہ نے مصر کو غیر جانبدار رویہ میں پختہ کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مصری حلقوں میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ انہیں پنڈت نہرو نے غیر جانبداری پر آمادہ کیا۔ اور صدر سوئیکارنو نے غیر جانبداری میں پختہ کر دیا ہے۔ غیر جانبداری فی ذاتہ نہ مفید ہے نہ مضر۔ لیکن موجودہ حالات میں اسے ایک خاص مطلب کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ روس اور چین اور ان کے ہمنوا بالخصوص ہندوستان اس کوشش میں ہیں کہ مغرب کے اثر کو کم کرنے کے لئے ایشیا میں غیر جانبداری کی روش کو عام کیا جائے۔ مسلمان ممالک پر بھی اس سلسلہ میں کافی التفات کی گئی ہے۔ مصر کو خصوصیت سے پھانسا گیا اور یہ کام ہندوستان نے کیا۔ اس کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ ممالک اسلامیہ کو غیر جانبداری کا سبز باغ دکھا کر ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ مصر جو اس دام میں آیا تو اس نے عرب ممالک کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اب یہ کہا جارہا ہے کہ یہ روش پختہ تر ہو گئی ہے۔

عراق اس روش افتراق کا بڑے تدبر اور دوربینی سے ازالہ کرنے میں مصروف ہے۔ انہی دنوں اس نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اسرائیلی حکومت کی جارحیت کے مداوے کی یہ صورت ہے کہ عرب لیگ کا اجلاس طلب کیا جائے۔ اور عربوں کے مشترکہ دفاعی منصوبے کو عملی شکل دی جائے۔ اس کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ عربوں میں باہمی بداعتمادی کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے اسے بھی رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تجویز بڑی معقول ہے اور ممالک اسلامیہ اور بہی خواہان عالم اسلامی اسے یقیناً مستحسن سمجھیں گے۔ لیکن ابھی سے اس خدشے کا اظہار کیا جارہا ہے کہ مصر شاید اسے اس لئے تسلیم نہ کرے کہ اسے عراق نے پیش کیا ہے اور عراق ترکی اور پاکستان سے معاہدہ کرنے کا "مجرم" ہے۔ ذرا بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس تجویز سے کئی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے عالم عرب کے اتحاد باہمی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ عراق کی وساطت سے متحد عالم عرب ترکی اور پاکستان کا حلیف ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس وسیع تر معاہدے کو مشرق وسطیٰ کی مشترکہ دفاعی تنظیم میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تجویز مصر کے تدبر کا امتحان ہے۔ اگر اسے عالم عرب اور عالم اسلامی کا اتحاد عزیز ہے اور اس کا وہ کئی بار اعلان کر چکا ہے۔ تو اسے اس تجویز کو تسلیم کرکے اس کی عملی صورت پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

انڈونیشیا کا بحران ابھی تک حل نہیں ہوسکا گو اس کے متعلق پریشانی کم ہو گئی ہے۔ فوج اور حکومت میں کئی ہفتوں سے زورآزمائی ہو رہی تھی۔ حکومت نے جنرل اُتویو کو چیف آف اسٹاف تسلیم کیا تو فوج نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فوج جسے حکومت کے ماتحت ہونا چاہیئے اس پوزیشن کو تسلیم نہیں کرتی۔ اسے یقیناً گوارا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فوج کی "بغاوت" کی وجہ یہ تھی کہ یہ تقرر اشتراکی خیالات کے مالک وزیر دفاع کا کیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی توجیہہ یہ کی گئی کہ کمیونسٹ حضرات کو فوج کی کلیدی اسامیوں پر متعین کیا جارہا ہے۔ حکومت نے مصالحت کے لئے یہاں تک کوشش کی کہ فوج اس تقرر کو تسلیم کرلے تو نئے چیف آف اسٹاف استعفا دے دیں گے۔ لیکن فوج نے یہ تجویز مسترد کردی۔ اس پر پہلے وزیر دفاع نے استعفا دیا۔ اس سے بھی کشمکش کم نہ ہوئی تو بالآخر وزیر اعظم نے استعفا دے دیا۔ یہ قضیہ بڑا ہی افسوسناک ہے۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ انڈونیشیا میں ایسی شخصیتیں موجود ہیں جو بحران میں آگے بڑھ کر سب کا اعتماد حاصل کرسکتی ہیں چنانچہ عمومی مطالبہ یہ ہوا کہ نائب صدر ڈاکٹر حتیٰ میدان میں آئیں اور نئی حکومت مرتب کریں۔ اب نئی حکومت مرتب ہو گئی ہے لیکن آیا اس سے یہ ناخوشگوار قضیہ واقعی ختم ہو جائے گا۔ اس کا ثبوت کچھ دیر میں ملے گا۔

بین الاقوامی جائزہ

(صـ ۱۱ سے آگے)

نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ابھی تک بمبئی میں پرتگیزی قونصل جنرل موجود ہے۔ اور گوا میں ہندوستانی قونصل جنرل۔ لیکن یہ تمہید اس انقطاع کی ہے۔ اب کے پھر خطرہ محسوس کیا جارہا ہے کہ ۱۵ر اگست کو گوا پر ہندوستانی رضاکار یورش کریں گے۔ اس یورش کی تیاریاں پچھلے سال بھی کی گئی تھیں لیکن کچھ نہیں بن سکا تھا۔ اس سال تو کانگریس نے علانیہ طور پر ایسے اقدام کی مذمت کردی ہے۔ گویا ہندوستانی حکومت کو یقین ہے کہ وہ دہمکی سے کام نہیں نکال سکتی۔

سائپرس کا مسئلہ بدستور پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ برطانیہ نے بڑی کوشش سے ترکی اور یونان کو رضامند کرلیا کہ وہ ۲۹ر اگست کو ایک کانفرنس میں اس پر غور کریں۔ یونان اس کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہو گیا ہے لیکن اس نے اس معاملہ کو اقوام متحدہ میں بھی پہنچا دیا ہے۔ یہ معاملہ پہلے بھی اقوام متحدہ میں پیش ہو چکا ہے لیکن اس پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ اب ہوسکتا ہے کہ ۲۹ر اگست کی کانفرنس بے نتیجہ رہ جائے تو یہ معاملہ ۲۰ر ستمبر سے جنرل اسمبلی کے شروع ہونے والے اجلاس میں پیش ہو جائے۔ برطانیہ کی رائے یہ ہے کہ اس اقدام کا اثر اگست والی کانفرنس پر اچھا نہیں پڑے گا۔

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے - ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا - اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے - یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس* روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی - اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی - اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے -

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے - جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں -

★ ★ ★

اسلامی دستور

اور

اسلامی نظام

سے متعلق قرآن کا نقطہ نگاہ کیا ہے؟

ان اہم ترین موضوعات پر مفصل اور اچھوتی بحث کے لئے دیکھئے -

قرآنی دستور پاکستان (صفحات ۲۲۴ - قیمت -/۲/۸ روپے)

اور

اسلامی نظام (صفحات ۱۸۰ - قیمت دو روپے)

August 6, 1955.   TOLU-E-ISLAM, KARACHI.   Regd. No. S. 1089.

تاریخ الامت

(از ۔ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ)

تاریخ کی وہ کتاب جس کے لئے علامہ موصوف کا اسم گرامی ہی کافی ضمانت ہے ۔

تقسیم سے پہلے ہندوستان کی بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب
شامل تھی ۔ لیکن کچھ عرصہ سے ناپید ہوگئی تھی ۔

طلوع اسلام

نے اسے مولف کی اجازت سے دوبارہ چھاپا ہے ۔
اس کے دو حصے تیار ہوچکے ہیں ۔
پہلا حصہ سیرت رسول اللہ کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے ۔ اور دوسرا حصہ خلافت راشدہ کے متعلق ہے ۔ تیسرا اور چوتھا حصہ چھپنے کے لئے تیار ہے ۔ پوری کتاب آٹھ حصوں میں ہے ۔
باقی حصے رفتہ رفتہ تیار ہوتے جائیں گے ۔

قیمت حصہ اول (موٹے ٹائٹل کے ساتھ) دو روپے
،، حصہ دوم (،،) اڑھائی روپے
} علاوہ محصول ڈاک

جلد فرمائشیں بھیجئے کیونکہ کتاب محدود تعداد میں چھپوائی گئی ہے ۔ "معاونین" کو کتاب از خود بھیجدی جائیگی ۔ جو حضرات کتاب نہ منگانا چاہیں دس اگست تک اطلاع دیں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۳ ۔ کراچی ۔۳

Title Printed at Mueed Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi.   Editor: KHURSHID ALAM

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوع اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۲۸ | کراچی: ہفتہ - ۱۳ - اگست ۱۹۵۵ء | قیمت چھ آنہ سالانہ پندرہ روپے

۱۵ اگست کا پیغام

حضرت عمر (رض) کے زمانے میں ایک مرتبہ ملک میں قحط پڑ گیا تو اردگرد کی ساری آبادی سمٹ کر مدینے میں جمع ہو گئی (جسطرح مصیبت زدہ پناہ گزیں آجکل کراچی میں جمع ہو رہے ہیں)۔ حضرت عمر (رض) نے حکم دیدیا کہ مدینہ میں کوئی شخص اپنے گھر میں کھانا نہیں کھائیگا۔ نہ ہی کسی کے ہاں انفرادی طور پر کچھ پکیگا۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے سب ایک جگہ جمع ہوگا اور سبکو ان پناہ گزینوں کے ساتھ ملکر ایک دسترخوان پر کھانا ہوگا۔ اس میں خود امیرالمومنین کا کھانا بھی شامل تھا۔ مسلسل فاقوں اور موٹی جھوٹی روٹی کھانے سے حضرت عمر (رض) بیمار پڑ گئے۔ گھی کی جگہ تیل کے استعمال سے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقاء نے کئی مرتبہ کہا کہ آپ نسبتاً اچھی غذا کھائیے۔ قوم کو آپ کی صحت کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن آپ انہیں یہ کہکر خاموش کردیتے کہ۔ خون شہ رنگیں تراز معمار نیست۔ آپکی احساس ذمہ داری کا یہ عالم تھا کہ دن بھر ان مصیبت زدگان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے اور رات کو چپکے چپکے گشت لگا کر سارے حالات معلوم کرتے۔ ان لوگوں کے غم میں آپ اسقدر نڈھال تھے کہ صحابہ کو یہ اندیشہ ہوگیا کہ اگر قحط جلدی رفع نہ ہوا تو حضرت عمر (رض) مسلمانوں کی فکر میں مر جائینگے۔

پاکستان کے ارباب حکومت کے نام ۱۵ اگست کا پیغام یہ ہے کہ اگر قوم کی مصیبتوں کو رفع کرنے کیلئے آپ حضرت عمر (رض) کی مثال قائم نہیں کرسکتے تو آپ کو ان کرسیوں پر بیٹھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

1. تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اس طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہوں گی وہ صحیح ہوں گی، جو اس کے خلاف ہیں وہ غلط ہیں۔
4. حضور نبی کریم انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن بعض نادانوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا مکمل سیرت ساز خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک ہی نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت کا یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
8. ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

ابتداً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں اس قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی ذاتی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ یوم آزادی ★ خوش آمدید ★ آزادی کے آٹھ سال ★ ٹوئن بی سے چھ سوالات
★ باب المراسلات ★ مجلس اقبال ★ طلوع اسلام کا مسلک ★ معماران پاکستان کا تصور
★ اسلامی دستور کے بنیادی اصول

پاکستان کے سرمایہ داروں کے نام

خدا کا پیغام

رزق کا سرچشمہ زمین ھے جسے ھم نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے سفت عطا کیا تھا لیکن تم اس کے مالک ھی بن بیٹھے ھو! ذرا سوچو کہ اس کھیتی میں جو زمین سے پیدا ھوتی ھے تمہارا کتنا حصہ ھے اور ھمارا کتنا؟ افرءیتم ماتحرثون (۵۶/۶۳)۔ تم اتنا ھی کرتے ھو کہ اس میں بیج ڈال دو۔ کیا اسکے بعد یہ قوت بھی تمہیں حاصل ھے کہ اس بیج کو آگا کر پودا بنا دو! ءآنتم تزرعونہ امنحن الزارعون۔ اگر ھم اس کھیتی کو پروان نہ چڑھائیں تو فصل کا گھر لے جانا تو ایک طرف، بیج کی قیمت کی بھی تم پر چٹی پڑجائے اور تم اپنا سر پیٹ کر پکار اٹھو کہ۔ انا لمغرمون بل نحن محرومون۔ پھر تم اس پانی پر غور کرو جس پر زندگی کا دار و مدار ھے۔ کیا اسے تم بادلوں سے برساتے ھو یا ھمارا قانون ایسا کرتا ھے؟ ءانتم انزلتموہ من المزن امنحن المنزلون۔ اور اس آگ کو دیکھو۔ کیا اس کی حرارت تمہاری پیدا کردہ ھے۔ ءانتم انشاتم شجرتھا ام نحن المنشئون۔ سوچو اور جواب دو کہ

پالتا ھے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ھے سحاب
کون لایا کھینچکر پچھم سے باد سازگار
خاک یہ کس کی ھے کس کا ھے یہ نور آفتاب
کس نے بھردی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ھے خوئے انقلاب

بولو! یہ کچھ تم کرتے ھو یا ھم کرتے ھیں؟ پھر بتاؤ کہ تم کس طرح اسے اپنی ملکیت بنائے بیٹھے ھو؟ ھم نے اسے بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لئے بنایا تھا۔ نحن جعلنھا تذکرۃ و متاعا للمقوین (۵۶/۷۳) تم نے اسے اپنی عشرت سامانیوں کا ذریعہ بنالیا؟ تم اس پر سے اپنے ذاتی قبضے اٹھالو تاکہ یہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رھے۔ سواء للسائلین (۴۱/۱۰) اگر تم نے از خود ایسا نہ کیا تو ھمارا قانون مکافات خود آگے بڑھ کر اسے تم سے چھین لیگا اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکوگے۔ وماانتم بمعجزین فی الارض ولافی السماء (۲۹/۲۲)۔

(ماخوذ از نظام ربوبیت)

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸	ہفتہ — ۱۳ اگست ۱۹۵۵ء	نمبر ۲۸

یوم آزادی

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰/۱۴)

پھر ہم نے، سابقہ حکمرانوں کے بعد، زمام اقتدار تمہارے ہاتھ میں دیدی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟

غزل سرائے و نواہائے رفتہ باز آور
بایں فسردہ دلاں حرفِ دل نواز آور

آزادی!

اس آسمان کے نیچے، انسان کے لئے اس لفظ (آزادی) سے زیادہ قیمتی لفظ اور کوئی نہیں اسلئے کہ سطح ارض پر صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اپنا سر اونچا کرکے چلتی ہے۔ لہٰذا سرفرازی اور انسانیت لازم و ملزوم ہیں۔ اسی کا نام آزادی ہے۔ ہزار خوش بختیاں اور سعادت مندیاں ہیں اس قوم کے حصہ میں جسے دنیا میں آزادی نصیب ہو۔

لیکن بازار بیع و شریٰ میں فطرت بڑی سخت گیر اور خشک چشم سوداگر واقعہ ہوئی ہے۔ وہ اپنی کسی جنس کو دوسرے کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتی جب تک اس کی قیمت وصول نہیں کرلیتی۔ اور جو خریدار قیمت کی ادائیگی میں پس و پیش کرتا ہے وہ اس کے ہاتھوں میں دی ہوئی متاع کو واپس لے لیتی ہے۔ وہ جذبات سے متاثر نہیں ہوتی۔ اس کی نگاہ ہمیشہ ترازو کے پلڑوں پر رہتی ہے۔ جب عام چیزوں کے داد و ستد میں فطرت کا انداز یہ ہے تو ظاہر ہے کہ آزادی جیسی متاع گراں بہا (بلکہ بے بہا) کے لئے وہ کسی سے کب رعایت برتنے لگی؟ وہ بالکل رعایت نہیں برتتی۔ اس کے دام کرٹے اور سودا نقد ہے۔ اس نے دروازے سے باہر جلی حروف میں لکھ رکھا ہے Terms cash آزادی ملتی اسے ہے جو اس کی قیمت ادا کرتا ہے (اور باقی بھی اسی کی رہتی ہے) جو قیمت کی ادائیگی میں تساہل برتتا ہے۔ اس سے آزادی چھن جاتی ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات یونہی وجود میں آگئی اور اس کا کاروبار بھی یونہی ہنگامی طور پر چل رہا ہے۔ یونہی اتفاق سے کسی قوم کو آزادی مل جاتی ہے اور اتفاقی حوادث سے وہ چھن جاتی ہے۔ ان سے تو کچھ کلام نہیں۔ لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس کائنات میں ہر فیصلہ ایک قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے اور جو کچھ واقعہ ہوتا ہے وہ کسی خاص عمل کا نتیجہ ہوتا ہے، ان کے لئے اس حقیقت کا بیان نہ کسی تعجب کا باعث ہوگا نہ حیرت کا موجب کہ قوموں کی آزادی اور غلامی کے لئے بھی ایک اٹل قانون مقرر ہے جس میں کسی کے لئے کوئی تغیر و تبدل اور رو رعایت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہاں نہ کوئی قوم ابناء اللہ (خدا کی چہیتی اولاد) ہے نہ سوتیلی۔ یہاں ہر قوم کا معاملہ ایک ہی قانون کے مطابق فیصل ہوتا ہے اور ہر فرد اور ہر قوم اس قانون سے یکساں فاصلے پر (EQUIDISTANT) ہوتی ہے۔ جس قانون کے مطابق قوموں کو آزادی ملتی اور چھنتی ہے۔ اسے اس ضابطۂ قوانین (قرآن) کی اصطلاح میں "قانون استخلاف و استبدالِ قومی" (LAW OF SUCCESSION AND SUBSTITUTION OF NATIONS) کہا جاتا ہے۔ قرآن نے جہاں اس قانون کو بیان کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس کی تشریح و تبیین بھی اس انداز سے کردی ہے کہ کسی کو اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام نہ ہو۔ کہیں کائناتی دلائل سے اور کہیں تاریخی شواہد سے۔ اس قانون کی تفصیل و تفسیر تو طویل ہے لیکن قرآن نے اسے ایک مقام پر چند الفاظ میں اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ بنگاہِ بصیرت سے دیکھا جائے تو اس کے ارتکاز میں قوموں کی زندگی اور موت کے تمام اصول "ایٹم" بن کر دکھائی دینے لگ جاتے ہیں۔ وہ اصول یہ ہے کہ

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

یعنی زندگی اور بقا اس کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔ دنیا میں وہی نظام، وہی مملکت، وہی قوم زندہ رہ سکے اور آگے بڑھ سکے گی جو ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہوگی جس میں نوع انسانی کے لئے بیش از بیش سامان بہبود و منفعت ہوگا۔ کائنات کی طبعی زندگی میں بقاء للاصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا قانون جاری ہے۔ لیکن انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں "اصلح" وہی ہے جو "انفع" ہے۔ یعنی جو نوع انسانی کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس اصول کے دو حصے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نظام کو نفع رساں ہونا چاہیئے۔ جو نظام نقصان رساں ہے وہ کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اور جو نہ نقصان پہنچاتا ہے نہ فائدہ، بقا اس کے نصیب میں بھی نہیں۔ یعنی یہی نہیں کہ جو نظام زندگی کی منفی اقدار (NEGATIVE VALUES) رکھتا ہے (اس کو نقصان رساں کہتے ہیں) وہ باقی نہیں رہتا، بلکہ جو جامد ہے، بقا اس کے حصے میں بھی نہیں۔ بقا اور استحکام صرف اس نظام کے لئے ہے جو زندگی کی مثبت اقدار (POSITIVE VALUES) کا مظہر اور نفع رسانیوں کا حامل ہے۔ دوسرا گوشہ اس اصول کا یہ ہے کہ اس نظام کی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، خاص جماعت یا خاص پارٹی یا خاص قوم تک محدود نہ ہوں بلکہ وہ تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوں۔ اس کی منفعت عالمگیر اور حدود فراموش ہو۔ اگر کسی نظام کی منفعت کوشیاں کسی خاص طبقہ یا پارٹی تک ہی محدود ہو کر رہ جائیں، تو بھی اسے بقا اور استحکام نصیب نہیں ہوسکتا۔

ایک طرف تو یہ نظام ہے۔ دوسری طرف وہ نظام ہے جسے قرآن "بخل" کا نظام کہہ کر پکارتا ہے۔ بخل کے معنی ہیں سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر رکھ لینا۔ اس نظام میں برسر اقتدار گروہ رزق کے سرچشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر ان کے ماحصل کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ اس نظام کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں، نظام سرمایہ داری کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس نظام کے مظہر بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار۔ اور بڑے بڑے کارخانہ دار اور سوداگر ہیں۔ یہ طبقہ تعداد کے لحاظ سے ملک کی آبادی کا قلیل ترین حصہ ہے لیکن مملکت کی ساری دولت انہی کے قبضہ میں ہے باقی آبادی ان کے رحم و کرم پر جیتی ہے انہی میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ کر حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہو جاتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ ایسے قوانین مرتب کرتے رہیں جن سے اس سرمایہ دار طبقہ کے مفاد محفوظ رہیں۔ یہ ہے وہ نظام جس کے متعلق قرآن کا فیصلہ ہے کہ انہیں کچھ وقت کے لئے بیش یا افتادہ مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن انہیں استحکام اور بقا کبھی نصیب نہیں ہوسکتی۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (۴۷/۳۸) جو مفاد پرست نظام یا گروہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے مخصوص کرلیتا ہے۔ تو وہ اگرچہ بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے لئے سب کچھ حاصل کر لیا ہے۔ لیکن وہ درحقیقت اپنے آپ کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر رہا ہے۔ وہ انہیں جھنجوڑ کر کہتا ہے کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے ہمارے اس قانون سے (کہ باقی وہی رہے گا جو نوع انسانی کے لئے زیادہ منفعت بخش ہوگا) روگردانی کی تو سُن رکھو کہ خدا کا قانون استخلاف و استبدال تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا۔ جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ انہی کے متعلق وہ (اس سورہ کے شروع میں) کہتا ہے کہ یہ لوگ انسانی سطح کی زندگی بسر نہیں کرتے۔ ان کی زندگی حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) ہوتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (۴۷/۱۲)۔ یہ لوگ جو (خدا کے اس ابدی قانون سے انکار کرتے ہیں) زندگی کا مقصد اتنا ہی جانتے ہیں کہ حیوانوں کی طرح کھایا، پیا، سوچ اڑائی، اور بس۔ آپ حیوانوں کی زندگی پر غور کیجئے ان کے سامنے صرف اپنا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ جو بیل خود چارہ کھا رہا ہو اسے اس سے تعلق واسطہ نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ بندھا ہوا بیل کتنے دنوں سے بھوکا ہے۔ یہ انداز زندگی کا نتیجہ؟ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲) ان کی متاع حیات جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہے۔ اس سے اگلی آیت میں اس کی تصریح کردی کہ اس قسم کی قومیں تھیں أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (۴۷/۱۳) ہم نے انہیں تباہ و برباد کردیا۔ اور کوئی انہیں بچا نہ سکا۔ انہی کے متعلق سورۂ انبیاء میں ہے وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ (۲۱/۱۱) اور ہم نے کتنی ہی ایسی قوموں کو تباہ کردیا، جو حقوق انسانیت میں کمی کیا کرتی تھیں۔ اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا کھڑا کیا۔ ان تباہ ہونے والی قوموں کی کیفیت یہ تھی کہ فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُم مِّنْهَا يَرْكُضُونَ۔ جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھا تو اس سے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانون مکافات نے انہیں للکار کر کہا کہ لَا تَرْكُضُوا یہیں کھڑے رہو۔ اب تم بھاگ کر کہاں جاسکتے ہو۔ وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ۔ تم نے دوسروں کی کمائی سے اپنے لئے جو سامان عیش فراہم کر رکھا تھا اور لوٹنے لوٹنے بڑے بڑے محلات تعمیر کر رکھے تھے۔ ذرا ان کی طرف پلٹ کر چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ (۲۱/۱۳) تاکہ تم سے یہ پوچھا جائے کہ یہ کچھ تم نے کہاں سے لیا تھا اور تمہیں کیسے حق پہنچتا تھا کہ تم دوسروں کی کمائی پر عیش اڑاؤ۔

قرآن میں اس قسم کی بے شمار آیات ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ نظام جس میں دولت سمٹ کر چند افراد کے قبضہ میں آجاتی ہے اور باقی مخلوق ان کے رحم و کرم پر زندگی کے دن کاٹتی ہے کس بری طرح تباہ و برباد ہوتا ہے۔ نہ پھر اس قوم کی مملکت باقی رہتی ہے نہ آزادی۔ اس قوم کی جگہ ایک دوسری قوم لے لیتی ہے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے، جو نہ آج تک کسی کی خاطر بدلا ہے۔ نہ بدلے گا۔

اب اس قانون کی روشنی میں پاکستان کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ یہاں "مَا يَنفَعُ النَّاسَ" کا نظام کارفرما نہیں بلکہ "مترفین" کا نظام مکمل مسلط ہے۔ ملک میں معدودے چند لوگوں کا ایک گروہ ہے جو رزق کے تمام سرچشموں پر قابض ہے۔ کچھ لوگ ان میں سے زمینوں پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں۔ کچھ کارخانے سنبھالے ہوئے ہیں۔ کچھ تجارت کے نقاب میں کالی منڈیوں (BLACK MARKETS) کے اجارہ دار ہیں۔ کچھ جائیدادوں کے مالک ہیں۔ انہی میں سے کچھ آگے بڑھ کر اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر وزارت کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں جسے ہم وزارتوں کے ٹوٹنے اور بننے، یا جدید انتخابات کے ذریعے، تبدیلی کہتے ہیں وہ دراصل اس گروہ کے بعض افراد کا دوسرے افراد سے بدلنا ہوتا ہے۔ یعنی اس تبدیلی سے ہوتا صرف اتنا ہے کہ اس گروہ کے کچھ افراد پیچھے چلے جاتے ہیں اور ان کی جگہ (اس گروہ میں سے) نئے افراد آگے آجاتے ہیں۔ اقتدار بدستور اسی طبقہ کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ گذشتہ آٹھ سال سے پاکستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور قرآن کے اس ابدی اصول کے مطابق جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، معاشرے میں زندگی اور توانائی کے آثار دن بدن کم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور قوم جہنم کی تباہیوں کی طرف کشاں کشاں بڑھتے چلی جارہی ہے۔ قوم خود بڑھتے نہیں جارہی بلکہ اسے ہنکا کر جہنم کی طرف لیجایا جارہا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴/۲۸) کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی نعمت سے نوازا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کی ناسپاس گزاری کی اور اپنے کاروان ملت کو اس منزل میں جا اتارا جہاں اس جنس کا کوئی خریدار ہی نہیں۔ جَهَنَّمَ (۱۴/۲۹) یعنی وہ انہیں جہنم میں لے گئے۔ قوم کے سادہ لوح جمہور ہر نئی وزارت کی تشکیل اور ہر نئی اسمبلی کی ترتیب کے ساتھ اپنی نئی نئی امیدیں باندھتے اور اس طرح اپنے آپ کو فریب دیتے رہے لیکن ان کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ مفاد پرست گروہ نے بھی انہیں اسی فریب میں مبتلا رکھا کہ نقص افراد کا ہے۔ افراد کے بدلنے سے حالات سدھر جائیں گے۔ اور اس طرح عوام کی توجہ کو اس طرف آنے ہی نہیں دیا کہ نقص افراد کا نہیں بلکہ اس نظام کا ہے جس کے نمائندے یہ افراد ہیں۔ لہٰذا جب تک یہ غلط (غیر قرآنی) نظام نہیں بدلتا، اصلاح حال کی کوئی صورت پیدا ہو نہیں سکتی۔ غلط نظام سے خوشگوار نتائج کی توقع رکھنا، فطرت کے خلاف جنگ ہے۔ جس میں آج تک نہ کسی قوم کو کامیابی ہوسکی ہے نہ ہوسکے گی۔ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ۔ (۲۹/۲۲)

سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں اتنی واضح اور دولتمند طبقہ کی بدعنوانیاں اور چیرہ دستیاں اس قدر عیاں ہوتی ہیں کہ ان کے پیش نظر اس نظام کا ایک دن کے لئے ٹھہرنا بھی ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے ایک اور گروہ آگے بڑھتا ہے اور اس انسانیت کش نظام کے قیام کے لئے سہارے فراہم کرتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو اس نظام کی تائید میں مذہب کی سند پیش کرتا ہے، اور ایک تقدس آمیز دبدبے سے ڈانٹ کر کہتا ہے کہ جس دولت اور املاک کو خدا اور اس کے رسول نے جائز قرار دیا ہو کس کی مجال ہے کہ انہیں ناجائز ٹھہرائے حالانکہ جس مذہب کو وہ اس کی تائید میں پیش کرتا ہے وہ نہ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا ہے، نہ اس کے رسول کا دیا ہوا۔ وہ مفاد پرست گروہ کا خود ساختہ ہوتا ہے پاکستان میں بھی یہی کچھ ہوا۔ سرمایہ دار طبقہ نے مملکت کی دولت اور اقتدار پر قبضہ جمایا۔ اور مذہبی مفاد پرستوں نے ان کے حق میں فتوے دینے شروع کردیئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب پنجاب میں یہ تجویز زیر غور تھی کہ بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت کی حدبندی کرنی چاہیئے اور کسی شخص کو اس اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ اتنے رقبے سے زیادہ زمین قبضہ رکھ سکے۔ تو میرزا بشیر الدین محمود (امیر جماعت قادیانی) اور سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی (امیر جماعت اسلامی) نے ملکیت زمین کے موضوع پر مستقل کتابیں شائع کی تھیں۔ مودودی صاحب نے اس میں لکھا تھا کہ

> اسلامی قانون بیع و شریٰ نے کسی نوعیت کی جائز اشیاء کے معاملہ میں بھی یہ پابندی عائد نہیں کی کہ آدمی زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص حد تک ان کو خرید سکتا ہو اور اس سے زیادہ کی خریداری کا مجاز نہ ہو۔ خرید و فروخت کا غیر محدود حق جس طرح تمام جائز چیزوں کے معاملہ میں آدمی کو حاصل ہے۔ اسی طرح زمین کے معاملہ میں بھی ہے۔

اس کے بعد تحریر تھا۔

> اسلام نے کسی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہے۔ روپیہ پیسہ جانور استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔

اور آخر میں یہ فتویٰ کہ

> مزارعت (زمین کو بٹائی وغیرہ پر دینے) کی حرمت اور خود کاشتی کی قید اور ملکیت زمین کے لئے رقبہ کی حدبندی اسلام کے مجموعی نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ (صفحہ ۵۲-۵۴)

اور جب یہ تجویز سامنے آئی کہ ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں دیدیا جائے۔ یعنی انہیں (NATIONALISE) کر دیا جائے، تو ارشاد ہوا کہ

> اسلام ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے پروگرام کو بطور اصول کے اختیار نہیں کرتا۔ یہ چیز اسلام کے سارے اجتماعی نظام کے مزاج کے خلاف ہے (ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۴ء)

آپ غور کیجئے کہ نظام سرمایہ داری کو اس سے بڑا سہارا اور کونسا مل سکتا ہے؟ ان حضرات کی تکنیک یہ ہے کہ یہ نظام سرمایہ داری کی بنیادوں کو تو مضبوط کرتے رہیں گے۔ لیکن حکومت کو اپنے طعن و تنقید کا نشانہ بناتے چلے جائیں گے تاکہ انہیں عوام میں مقبولیت حاصل رہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جب تک ایک بڑا زمیندار اپنی زمینداری پر اور ایک بڑا کارخانہ دار اپنے کارخانہ پر رہے گا، یہ اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن ان میں سے جونہی کوئی ایوان حکومت میں آیا، انہوں نے اس کی ہوسناکی اور کامجوئی، نقش کاری اور بے حیائی، کاک ٹیل اور کلب کی داستانوں کو اچھالنا شروع کیا۔ اور جونہی وہ حکومت کی کرسی سے الگ

ہوا! ان کے طعن و تشنیع کے نشتروں سے محفوظ ہو گیا، حالانکہ اس شخص میں یہ تمام عیوب اسوقت بھی تھے جب وہ ایوانِ حکومت میں نہیں آیا تھا اور یہی کچھ وہ اسوقت بھی کرتا ہے جب وہ مسندِ حکومت کو چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ناجائز ذرائع سے روپیہ کمانے کا تعلق ہے یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آج اس کے لئے تجارت کا میدان سب سے زیادہ سازگار ہے۔ یہ ہمارے اربابِ شریعت ان تاجروں سے تو تھیلیاں وصول کرتے ہیں لیکن جب انہی تاجروں سے کوئی شخص حکومت کی کرسی پر آ بیٹھتا ہے تو اسے بددیانت اور بے ایمان مشہور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ تکنیک جس سے یہ حضرات نظام سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط کئے جاتے ہیں اور عوام میں اپنی مقبولیت پر حرف بھی نہیں آنے دیتے۔ سرمایہ دار طبقہ انھیں اپنا محافظ اور پاسبان سمجھتا ہے اور مطمئن ہے کہ اگر ملک میں لادینی نظام رائج ہوا تو بھی وہ سرمایہ داری کی حفاظت کریگا (کیونکہ وہ خود انہی کے طبقہ کا تمدین کردہ ہوگا) اور اگر ان اربابِ شریعت کا معین کردہ "اسلامی دستور" نافذ ہو گیا تو بھی وہ محفوظ رہیں گے۔ کیونکہ اس دستور کی رو سے سرمایہ داری عین اسلام قرار پا جائے گی۔ بلکہ یہ اسلامی دستور لادینی دستور سے کہیں بہتر ہوگا کیونکہ اس میں تو صرف دنیا ہی بٹے گی اور اس سے دنیا اور عاقبت" دونوں سنور جائیں گی۔

یہ ہے سرمایہ دار طبقہ اور اجارہ دارانِ مذہب کا وہ گٹھ جوڑ جو یہاں اس نظام کو تقویت دے رہا ہے جس کے متعلق قرآن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ طلوعِ اسلام قرآن کی دی ہوئی بصیرت کی روشنی میں اس باطل نظام کی مخالفت میں مسلسل آٹھ سال سے مصروفِ جد و جہد ہے۔ اس لئے کہ اس کا اس قرآنی حقیقت پر ایمان ہے کہ اس نظام میں نہ یہاں اسلام باقی رہے گا نہ پاکستان، اور آزادی کی وہ نعمتِ کبریٰ جو شرفِ انسانیت کی بلند ترین دلیل ہے، ہم سے دیکھتے دیکھتے چھن جائے گی۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے طلوعِ اسلام کی مخالفت ہوگی اور سخت مخالفت۔ لیکن چونکہ طلوعِ اسلام جو کچھ کہتا ہے، دین کی بنیادوں پر کہتا ہے اس لئے یہ طبقہ براہ راست تو اس کی مخالفت کر نہیں سکتا (کیونکہ وہ اپنے آپ کو دین کی سطح پر بات کرنے کا اہل نہیں پاتا) اس لئے ان کی مخالفت، ان اربابِ مذہب کے ہاتھوں سامنے آتی ہے جو اس طبقہ کے پشت و پناہ ہیں۔

طلوعِ اسلام جو کچھ کہتا ہے قرآن کی رو سے کہتا ہے۔ یہ حضرات قرآن سے سرمایہ داری کی تائید میں ایک حرف نہیں لا سکتے، اس لئے کہ قرآن تو اس نظام کی جڑ بنیاد کو اکھیڑنے کے لئے آیا تھا۔ اس نظام کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جو نبی اکرمؐ کی وفات کے صدیوں بعد اُس زمانہ میں وضع ہوئیں جب مسلمانوں کے معاشرہ پر نظام سرمایہ داری پوری طرح چھا چکا تھا۔ ان حضرات کا دعوےٰ ہے کہ دین، ان روایات کا نام ہے۔ طلوعِ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جو روایت قرآن کے خلاف جاتی ہو وہ کبھی نبی اکرمؐ کی ہو نہیں سکتی اس لئے یہ دیکھنے کے لئے کہ کونسی روایت صحیح ہو سکتی ہے اور کونسی غلط، معیار اور مدار قرآن ہے۔ چونکہ یہ حضرات دلیل و برہان سے طلوعِ اسلام کے ان دعاوی کی تردید کر نہیں سکتے اس لئے یہ کہکر عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیتے ہیں کہ طلوعِ اسلام منکر حدیث ہے۔ (معاذ اللہ) منکر شانِ رسالت ہے۔ اور نہ معلوم کیا کیا ہے!

اس طرح یہ لوگ عوام کے ذہن کو دوسری طرف منتقل کر کے، سرمایہ داری کے یکسر غیر قرآنی نظام کو محکم سے محکم تر بنانے کی سعیٔ نامشکور میں دن رات مصروف ہیں۔ یہ حقیقت کہ قرآن کس طرح نظام سرمایہ داری کا دشمن ہے اور غلط روایات کس طرح اس نظام کو مذہب کے عین مطابق بنا دیتی ہیں، ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ قرآن کسی کے پاس فاضلہ دولت جمع نہیں ہونے دیتا، اس لئے کہ نظام سرمایہ داری کی اصل بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہی ہوتی ہے۔ آپ قرآن میں دیکھئے، وہ روپیہ جمع کرنے والوں کو جہنم کا ایندھن بتاتا ہے۔ چنانچہ اس باب میں سورۂ توبہ میں اس نے کہا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ۔ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے، تو انہیں الم انگیز تباہی کی خبر دیدے۔ جب اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے ان کی پیشانیاں ان کے پہلو اور ان کی پشت پر داغ دیا جائیگا اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ لہٰذا جو کچھ تم اس طرح خزانہ بنا کر بیٹھ گئے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

یہ ایسی کھلی ہوئی تعلیم ہے جس کے بعد ایک مسلمان کے لئے دولت جمع کرنے کے جواز کی کوئی صورت ہی نہیں نکل سکتی۔ اور قرآن کے دیگر مقامات نے اس مفہوم کی اور بھی زیادہ وضاحت کر دی ہے۔ اس کی موجودگی میں سرمایہ داری کو کہاں پناہ مل سکتی تھی؟ لیکن اسے ان غلط روایات نے پناہ دیدی جو خود اسی نظام کے موئدین کی وضع کردہ ہیں۔ چنانچہ ترجمان القرآن (بابت اپریل ۱۹۵۵ء میں) اس آیت کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔

> یہ آیت اپنے عموم کی بنا پر کم یا زیادہ ہر صورت میں مال جمع کرنے پر وعید سناتی ہے۔ صحابہ کبار نے اس بارے میں اضطراب سا محسوس کیا لیکن رسول اللہؐ نے ان کے اضطراب کو یہ فرما کر دور کر دیا اِنَّ اللّٰہَ مایفرض الخ۔
> (ابو داؤد۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

یعنی قرآن کی آیت — کم یا زیادہ ہر صورت میں مال جمع کرنے پر وعید سناتی ہے۔ صحابہؓ کو (معاذ اللہ) اس وعید سے اضطراب پیدا ہوتا ہے (گویا وہ بنا بنجا سرمایہ داروں کی جماعت تھی جنھیں ایسے حکم سے سخت اضطراب پیدا ہوا) اور رسول اللہؐ (استغفر اللہ) اس اضطراب انگیز تعلیم کو بدل دیتے ہیں! چنانچہ وہ روایت جس کا حوالہ ترجمان القرآن نے دیا ہے یوں ہے۔

> ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ..... تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انھوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دونگا اور اس مشکل کو حل کر دونگا۔ پس حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبی اللہ۔ یہ آیت آپ کے صحابہ پر گراں ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔ ... ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ، یہ بیان سنکر حضرت عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ (مشکوٰۃ۔ جلد اول۔ کتاب الزکوٰۃ)

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک غلط روایت نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ قرآن کے احکام کے علی الرغم قارون جتنے خزانوں کا جمع کرتے چلے جانا عین مطابق اسلام قرار پا گیا بشرطیکہ اس میں سے اڑھائی فیصدی کی رقم ہر سال ان فتوےٰ دینے والوں کی نذر کر دی جائے۔ تاکہ ہر اُس شخص کو ملحد اور بے دین قرار دیتے ہیں جو یہ کہے کہ قرآن تو اس سرمایہ داری کی کہیں اجازت نہیں دیتا اور دولت جمع کرنیوالوں کو جہنم کا ایندھن بتاتا ہے۔ اور جب وہ یہ کہے کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد قرآن پر ہونی چاہئے تاکہ یہاں سے سرمایہ داری کی لعنت دور ہو، تو چاروں طرف سے شور مچایا جائے کہ پاکستان کا آئین ان روایات کی بنیادوں پر مرتب ہوگا۔ اسے لوگ (معاذ اللہ معاذ اللہ) سنت رسول اللہؐ قرار دیتے ہیں۔

یہ ہے جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ طلوعِ اسلام کو نہ کسی سرمایہ دار کی دولت سے کچھ واسطہ ہے نہ ان اربابِ شریعت کے غلط مذہب سے کچھ سروکار۔ اس کے سامنے تو ایک ہی مقصد ہے کہ یہ خطۂ زمین جو ہمیں نصیب ہو گیا ہے، کسی طرح باقی رہ جائے تاکہ اس میں کبھی قرآن کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق معاشرہ قائم ہو سکے۔ چونکہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ

مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳)

بقا اسی کے حصہ میں آئے گی جو نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہوگا، اس لئے وہ علی وجہ البصیرت دیکھتا ہے کہ جو عناصر یہاں نظام سرمایہ داری کے استحکام کی کوشش کر رہے ہیں، وہ پاکستان کے بہی خواہ نہیں ہیں لہٰذا وہ ان کی مخالفت کرتا ہے ان میں زمیندار، جاگیردار، کارخانہ دار، تجار اور ان کے پشتیبان، غلط مذہب کے علمبردار، اور اربابِ اقتدار سب شامل ہیں۔

یہ ہے طلوعِ اسلام کے پیش نظر مقصد اور یہ ہے اسکی مخالفت کی اصل وجہ جس کے متعلق معترضین اور ان کے سطح بیں موئدین نہ معلوم کیا کچھ سمجھتے اور کہتے رہتے ہیں۔

حیف کہ من بخون تپم ، وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری ، نالہ بہ سینہ بشمری!

جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے' اسے ہم مسلسل آٹھ برس سے لکھتے چلے آرہے ہیں اور آج' جبکہ اہل پاکستان یوم آزادی کا جشن منانے میں مصروف ہیں' اسے پھر دہراتے ہیں کہ

آزادی' اس آسمان کے نیچے خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ لیکن یہ قائم اسی صورت میں رہ سکتی ہے کہ یہاں ایسا نظام رائج ہو جو یہاں کے تمام افراد کے لئے نفع رساں ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام قوتوں کو شکست دیجئے جو سرمایہ داری کے انسانیت کش اور غیر قرآنی نظام کو محکم بنانے اور اس طرح پاکستان کو کمزور سے کمزور تر کرنے میں مصروف ہیں یہاں خدا کے متعین کردہ نظام ربوبیت کو نافذ کیا جائے۔ اسی میں پاکستان کا تحفظ اور ہماری آزادی کی بقا کا راز ہے۔ اور اسی سے ہماری دنیا اور آخرت سنورے گی۔

ہم ملک کے سنجیدہ طبقے سے درخواست کریں گے کہ وہ غور سے دیکھیں کہ ہم نے حالات کا جو تجزیہ کیا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔ اگر وہ ہم سے متفق ہیں کہ وہی یہاں کا اصل مرض ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور وہی اس کا علاج ہے جو ہم نے قرآن کی روشنی میں تجویز کیا ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ وہ ان نازک حالات میں جن سے ہم گذر رہے ہیں اپنا کیا فریضہ سمجھتے ہیں؟ یاد رکھئے۔ پاکستان کسی خاص گروہ اور خاص طبقے کی ملکیت نہیں۔ یہ ہم سب کا مسکن و مامن اور ہماری آنے والی نسلوں کا گہوارہ ہے۔ اور ان تمام حسین آرزوؤں کا محور جو ہم نے اس سے وابستہ کی ہوئی ہیں۔ اس لئے اس کا تحفظ اور استحکام ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ لہٰذا وہ طبقے جنھیں اس ذمہ داری کا احساس ہے ان کے ذمے بہت بڑا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ انھیں ہر یوم آزادی پر اس کا محاسبہ کرنا چاہئے کہ وہ کس حد تک اس فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ آئین ساز اسمبلی کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ پاکستان کا آئین' قرآنی نظام ربوبیت کے خطوط پر مرتب کرے اور اسطرح ان تمام تخریبی قوتوں کو عملاً شکست دیدے جو یہاں نظام سرمایہ داری کے تحفظ و استحکام کی کوشش کر رہی ہیں اور اسطرح پاکستان کو تباہی کے جہنم کی طرف لے جا رہی ہیں۔ اگر آپ کی کوششوں سے اس میں کامیابی ہو گئی تو اس سے یہاں اتنا بڑا خوشگوار انقلاب پیدا ہو جائیگا جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکے گی۔ واشرقت الارض بنور ربہا اور یہی پاکستان کے حصول کا مقصد تھا۔ اور یہی جشن آزادی کا صحیح مفہوم ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر یہ سب کچھ محض رسم پرستی اور خود فریبی ہے۔

مرکزی وزارت

مسٹر محمد علی نے بالآخر وزارت عظمیٰ سے استعفا دیدیا ہے۔ ان کا اس عہدے سے کنارہ کش ہونا جمہوری قواعد و ضوابط کے مطابق قابل ذکر یا حیران کن نہیں ہونا چاہیئے۔ پارلیمانی طرز حکومت میں وزیروں کی آمد و رفت لگی ہی رہتی ہے اور مسلّمہ اصولوں اور معین تقاضوں کے تحت وزارتی شکست و ریخت ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہماری سیاست کے انداز نرالے ہیں یہاں آنے کو تو ہر کوئی آ جاتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ آ کر وہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ جب کوئی بامر مجبوری جاتا ہے (یعنی روانہ کر دیا جاتا ہے) تو ملک اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ بالآخر اس کابوس سے گلو خلاصی ہوئی۔ لیکن یہ گلو خلاصی عارضی ثابت ہوتی ہے اور پھر یہ انتظار ہونے لگتا ہے کہ جسے نجات دہندہ سمجھا گیا تھا اس سے کب نجات ہوتی ہے۔ مسٹر محمد علی ناظم الدین وزارت کی برطرفی پر اپریل ۱۹۵۳ء میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے تھے۔ برطرف وزارت کا کابوس محترم غلام محمد صاحب' گورنر جنرل' کی مردانہ جرأت سے سینۂ ملت سے اترا تھا اور اس سے ملک بھر میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ محمد علی صاحب کو کس بنا پر اس منصب جلیلہ کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ ان کے ۲۸ مہینوں کے دور حکومت میں ملک چند در چند مصائب میں ہی مبتلا نہیں ہوا۔ بلکہ دنیا بھر میں مضحکہ بن گیا اور کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس سے یہ سمجھا جائے کہ یہ انتخاب مناسب تھا۔ پاکستانی سیاست جو پہلے ہی ناقابل رشک تھی اسے محمد علی صاحب نے اور گدلا کرنے میں ذرہ برابر عار محسوس نہیں کی۔ ان کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا اور جب بھی محب وطن پاکستانی اس کا تصور کریں گے' ان کا سر فرط ندامت سے جھک جائے گا کہ انھوں نے اپنی وزارت بچانے کے لئے فضل الحق صاحب کو دلائل و براہین سے "غدار" ثابت کیا۔ لیکن حالات بدل جانے پر جب اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے انھیں مولوی صاحب کی مدد کی ضرورت پڑی تو بڑی ڈھٹائی سے اپنے "منہ بولے غدار" کو مشرقی پاکستان پر ہی مسلط نہیں کر دیا بلکہ مرکز تک کو اس کی تحویل میں دینے کا راستہ ہموار کر دیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کی یہ ریشہ دوانیاں کامیاب نہیں ہوئیں اور ملک اس طائفے کے چنگل میں پھنسنے سے بچ گیا جو دشمنان پاکستان ہندوؤں کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے مسٹر محمد علی کے استعفے کا جتنا بھی خیر مقدم کیا جائے کم ہے۔

لیکن یہ بہرحال ایک سلبی صورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟ پہلا تجربہ ایسا نہیں کہ ہم پھر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ اس تجربے کی بنا پر یہی ڈر لگتا ہے کہ نباش اول کا جانا نباش ثانی کے آنے کی تمہید ہوگا۔ لہٰذا جن افراد کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے' ہم ان کی خدمت میں گزارش کرتے ہیں کہ وہ خدا کے لئے دور بینی سے کام لیں اور مفاد ملکی کو پس پشت نہ ڈالیں' ان پر بڑی نازک ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ ملک کے لئے آئین تیار کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور یہ وہ کام ہے جو آٹھ سال سے الجھتا چلا آرہا ہے۔ چونکہ موجودہ جوڑ توڑ کا آئین سازی پر گہرا اثر پڑیگا اس لئے ضرورت ہے کہ شخصی مفادات اور ذاتی اغراض سے بالا ہو کر اس کا تصفیہ کیا جائے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ مرکز میں مسلم لیگ اور عوامی لیگ کی مخلوط وزارت بن جانے کے امکانات روشن ہیں اور اگر ایسا ہوا تو اس وزارت کی قیادت مسٹر سہروردی کریں گے۔ اس میں اطمینان کا ایک پہلو یہ ہے کہ نام نہاد متحدہ محاذ مرکز پر مسلط نہیں ہو سکے گا اور دوسرا یہ کہ مغربی پاکستان میں (مسلم لیگ کی وساطت سے) اور مشرقی پاکستان میں (عوامی لیگ کی وساطت سے) تسلی بخش مفاہمت کی صورت پیدا ہو جائے گی جو کامیاب آئین کے لئے نیک فال ہے۔ اس صورت میں دونوں حصص ملک کے نمائندے ایک دوسرے کے معاون بن جائیں گے اور طے شدہ معاہدوں کو اپنے علاقوں سے منوا بھی سکیں گے۔ یہ واضح رہے کہ ہم مسٹر سہروردی کی قیادت میں مسلم لیگ اور عوامی لیگ کی مخلوط وزارت کے امکان کو محض اس امید پر خوش آمدید کہتے ہیں کہ اس میں پہلے فوری مسائل کے خاطر خواہ طور پر حل ہو جانے کا امکان نظر آتا ہے۔ یعنی ایک یونٹ بن جائیگا' متفقہ آئین منظور ہو جائیگا اور آزاد انتخابات عمومی کے لئے فضا سازگار ہو جائیگی۔ اگر یہ کچھ نہ ہوا تو حکومت ان خطوط پر بنے یا دیگر خطوط پر ملک کے لئے اس میں اطمینان کا کوئی پہلو نہیں ہوگا۔

خدا کرے کہ اس دفعہ کا آنیوالا آ کر وہ کچھ نہ کرنے لگ جائے کہ ملک پھر اس کے جانے کی دعائیں مانگنے لگ جائے۔

خوش آمدید

ہم نے اپنی سابقہ اشاعت میں خان عبدالغفار خاں کی تخریبی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سرحد میں ابھی تک وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اپنے خلوص' دیانت اور جوشیلے کردار سے نہ صرف سرخپوش تحریک ہی کو شکست دی تھی بلکہ پاکستان کو ان تمام مخالفتوں کے علی الرغم قائم کر کے دکھا دیا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ اگر زمام کار ان لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے تو عبدالغفار خاں صاحب کا از سر نو جگایا ہوا فتنہ پھر سے دفن کیا جا سکتا ہے۔ ان مخلص مجاہدین کی فہرست میں محترم خان بخت جمال خاں صاحب کا نام سب سے اوپر ہے۔ یہ وہ بطل جلیل ہے جس کی ساری عمر آزادی کی جنگ میں گزر گئی۔ پہلے یہ انگریز کے خلاف جنگ آزادی کے نشہ میں سرشار سرخپوش تحریک کو لیکر آگے بڑھے تو سرحد کے پہاڑوں تک کو ہلا دیا۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ اس تحریک کا رخ کعبہ کی بجائے بنارس کی طرف ہے تو یہ پوری ہمت اور مردانگی سے اسے چھوڑ کر تحریک پاکستان کی طرف آ گئے اور چند دنوں میں مسلمانان سرحد کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑا دیا۔ (یہ سرحد مسلم لیگ کے پہلے صدر تھے اور اگرچہ اس کے بعد کئی صدر آئے اور گئے لیکن اہل سرحد ابھی تک "صدر صاحب" انہی کو کہتے ہیں)۔ کانگریسی حکومت اور عبدالغفار خاں صاحب کی گاندھویت کے مقابلہ میں پاکستان کے حق میں ریفرنڈم کی کامیابی کا سہرا انہی "صدر صاحب" کے سر تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد جب سرحد میں پاکستان کی مسلم لیگی حکومت قائم ہوئی تو اس کا سب سے پہلا وار اسی بخت جمال خاں اور اس کے رفقاء پر ہوا' اس لئے کہ ارباب ہوس کو اس کا علم تھا کہ یہ لوگ ان کی بدعنوانیوں کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ ان

باقی صفحہ ۱۰ پر

سُنتِ رسُول اللہ کے متعلق

طلوعِ اسلام کا مسلک

حافظ زین الدین عراقی، جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرتِ منظوم کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیر
تجمع ما صح وما قد انکر

طالب کو جاننا چاہیئے کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں صحیح بھی اور غلط بھی۔

طلوعِ اسلام بھی یہی کہتا ہے اور یہ جانچنے کے لئے کہ کونسی روایت صحیح ہے اور کونسی غلط یہ معیار مقرر کرتا ہے کہ

(۱) جو روایت قرآن کے خلاف جاتی ہو وہ غلط ہے۔ اس لئے کہ حضور رسالتمآبؐ کا کوئی قول یا عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

(۲) جس روایت سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہوتی ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ حضورؐ سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور آپ کی حیاتِ طیبہ معراجِ انسانیت کا آئینہ تھی۔

اگر کوئی شخص اس مسلک کو قابلِ اعتراض سمجھتا ہے تو طلوعِ اسلام اس کے اس اعتراض کو کوئی وقعت نہیں دیتا، اس لئے کہ اس کے نزدیک ذاتِ رسالتمآبؐ کی عظمت ان اعتراضات سے بہت بلند ہے۔

اور اگر کوئی شخص اس باب میں اس کے سوا کوئی اور بات طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کرتا ہے تو وہ تہمت تراشتا اور غلط پراپیگنڈہ کرتا ہے۔

حدیث کے متعلق

طلوعِ اسلام کا مسلک

"یہ حقیقت یقیناً ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں اُن حالات میں اختیار کی گئی تھیں، انہیں ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حِکَم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا ردوبدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی واسطہ نہیں"۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۳۲۸-۳۲۷)

طلوعِ اسلام کا بھی یہی مسلک ہے کہ قرآنی اصولوں کی جو جزئیات نبی اکرمؐ نے متعین فرمائی تھیں، اگر ان میں سے کسی میں، زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت ہو تو وہ تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن

(۱) یہ تبدیلی صرف وہ اسلامی نظام کر سکتا ہے جو علیٰ منہاجِ نبوت، قرآنی حکومت کے قیام کے لئے وجود میں آئے۔ ہم یا آپ میں سے کسی فرد کو اس تبدیلی کا حق حاصل نہیں اور

(۲) جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو اور وہ ایسی تبدیلی نہ کر دے۔ اس وقت تک ان احکام میں کوئی ردوبدل نہیں کرنا چاہیئے۔

اگر کوئی شخص اس باب میں طلوعِ اسلام کے متعلق کچھ اور کہتا ہے تو وہ جھوٹا پراپیگنڈہ کرتا ہے۔

اور معتقدات کے متعلق:

اسلام اس کا سخت مخالف ہے کہ معتقدات کے معاملہ میں کورانہ تقلید کی جائے اور مذہبی فرائض کو رسماً ادا کر لیا جائے۔ اسلام نے جہالت اور تعصب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور انسانی عقل و فکر کو خواب سے بیدار کیا۔ اس نے کہا کہ انسان اس لئے نہیں بنایا گیا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی مہار پکڑ کر اسے چلاتا جائے۔ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ عقل و فکر اور علوم و فنون کی روشنی میں اپنی راہ نمائی آپ کرے۔ یعنی علوم فطرت (سائنس) اور تاریخی شواہد کی مشعل ہاتھ میں لے کر آگے بڑھتا چلا جائے۔ اسلام اس کا سخت مخالف ہے کہ جو باتیں ہمارے پاس ہمارے اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ انھیں بلا تحقیق و تنقید صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا جائے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ محض یہ بات کہ ایک شخص ہم سے پہلے گذر چکا ہے اس کی سند نہیں ہو سکتی کہ وہ شخص علم میں ہم سے بڑھ کر اور فہم و فراست میں ہم سے آگے تھا۔ فطری استعداد اور قلب و دماغ کی صلاحیتوں کے اعتبار سے اسلاف اور اخلاف میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا

اس طرح اسلام نے انسانی فکر و بصیرت کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا جس میں وہ صدیوں سے جکڑے چلی آ رہی تھی۔ اور اسے کورانہ تقلید سے نجات دلا کر آزادی کی وہ فضائے بسیط عطا کر دی جس میں وہ اپنی جدوجہد سے اپنے لئے آپ فیصلے کر سکے۔ صرف اس شرط کے ساتھ کہ جو حدود قوانین خداوندی نے متعین کر دی ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ ان حدود کے اندر انسانی علم و عقل پر کوئی پابندی نہیں عائد کی گئی۔ نہ ہی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں"۔

(مفتی محمد عبدہٗ مرحوم۔ در رسالۃ التوحید)

معمارانِ پاکستان کا تصوّر — پاکستان سے متعلق

علامہ اقبال

پاکستان کا تصور علامہ اقبال کا دیا ہوا ہے۔ حصولِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان میں کس قسم کا نظام دیکھنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انھوں نے اپنا نظریہ اس خط میں واضح کیا تھا جو انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائداعظم کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انھوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے۔ اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہوگئی تو اس کا نظام کن خطوط پر متشکل ہونا چاہیئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں

لیگ کو آخرالامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفع الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی (اس وقت حالت یہ ہے کہ آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہوجائیں گی (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت، اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جارہا ہے مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جارہا ہے۔ . . . اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک اس سے بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (DEVELOPMENT) دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کردیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کرلیا تو ہندومت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کرلینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

---

* پورا کرسکتے ہیں۔ اور انسانیت کو امن کا پیغام دے سکتے ہیں جو تحفظ اور اس کی فلاح اور بہبود کا ضامن ہوسکتا ہے۔

قائد اعظم

۱۹۴۱ء میں قائداعظم حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تو انھوں نے چند نوجوانوں کے سوالات کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کا ملخص حسب ذیل ہے ۔

جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا نام سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔ . . . . اشتراکیت بالشویکیت یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزا کا سا رابطہ اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا . . . . اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ (جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ میں آپ کے تحقیقاتی ادارہ کی سرگرمیوں کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتا رہوں گا اور دیکھتا رہوں گا کہ وہ کس طرح بنکاری کے وہ طریقے رائج کرتا ہے جو اسلام کے معاشری اور معاشی اصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لئے ان گنت مشکلات پیدا کردی ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب اسے تباہی سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے یہ انسان اور انسان کے درمیان انصاف کرنے اور بین الاقوامی کشیدگی کو کم کرنے میں وہ صریحاً ناکام رہا ہے۔ دنیائے مغرب مشینی ترقی اور صنعتی ہنرمندی کے باوجود ایسی مشکل میں گھری ہوئی ہے کہ اس کی یہ حالت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اب مغرب کے معاشی نظریات کے اپنانے سے ہم مسرتوں اور خوشحالیوں سے ہمکنار نہیں ہوسکتے ہیں۔ ہمیں اپنی تقدیر اپنے طور پر متشکل کرنا ہوگی اور دنیا کو ایسا معاشی نظام دینا ہوگا جو اسلام کے مساواتِ انسانی اور عدلِ عمرانی کے اصولوں پر مبنی ہو۔ اس طرح ہم مسلمان کی حیثیت سے اپنا مشن

(باقی پچھلے کالم کے نیچے)*

اسلامی دستور کے بنیادی اصول

۱۔ جب کوئی معاملہ زیرِ غور ہو تو اس کے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کی بابت کیا اصول دیا ہے۔

۲۔ قرآن کریم عام طور پر زندگی کے معاملات کے متعلق اصولی تعلیم دیتا ہے۔ ان اصولوں پر مختلف زمانوں میں ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔

۳۔ لہٰذا دوسری بات دیکھنے کی یہ ہوگی کہ اس معاملہ کے متعلق ہمارے زمانہ کی ضروریات اور ہماری مملکت کے تقاضے کیا ہیں؟

۴۔ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآن کے اس اصول کی کوئی عملی شکل احادیث کے مجموعوں میں، یا فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے؟

۵۔ اگر احادیث یا فقہ میں کوئی ایسی شکل مل جائے جو ہمارے زمانے کے تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک پورا کرتی ہے تو اس شکل کو اسی طرح اختیار کر لیا جائے۔

۶۔ اگر ان کتابوں میں کوئی شکل نہ ملے، یا ایسی شکل ملے جو ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کرتی ہو، تو جو شکل وہاں ملے اس میں مناسب ردّ و بدل کر لیا جائے یا حسبِ ضرورت کوئی نئی شکل خود مرتب کر لی جائے۔

۷۔ اسلامی مملکت میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی یعنی یہ مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ دیکھے کہ کوئی شخص یا اس کے بیوی بچے، کسی حالت میں بھی بنیادی ضروریاتِ زندگی مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، دوائی وغیرہ سے محروم نہ رہے۔

۸۔ اسی طرح یہ بھی مملکت کے ذمہ ہوگا کہ وہ ہر فردِ مملکت کی صلاحیتوں کے پورے پورے نشوونما کے لئے ضروری انتظام کرے۔

۹۔ مملکت ان اہم ذمہ داریوں سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب کہ رزق کے سرچشمے، یعنی وسائلِ پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت سے نکال کر مملکت کی مشترکہ تحویل میں رکھے جائیں۔

۱۰۔ اسلامی مملکت میں تمام افراد کو انصاف بلاقیمت ملے گا۔ یعنی کسی شخص کو عدالت سے فیصلہ لینے میں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔

۱۱۔ اسلامی مملکت میں ہر کام کے لئے افراد کا انتخاب ان کی ذاتی جوہروں کی بنا پر ہوگا نہ کہ اضافی نسبتوں کی بنا پر۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی پورا پورا انتظام کرنا ہوگا کہ جن افراد کو ملت کسی فریضہ کی سرانجامی کے لئے انتخاب کرتی ہے، انہیں عند الضرورت الگ کرنے کے اختیارات بھی ملت کے پاس رہیں۔ اس میں صدرِ ریاست سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے فریضے کے حامل سب شامل ہیں۔

۱۲۔ اسلامی مملکت میں قانون کی نگاہ میں سب یکساں ہوں گے اور حکومت کے ملازمین کو بھی اس باب میں کسی قسم کی کوئی خصوصیت نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ملازمینِ حکومت کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکیں۔

۱۳۔ اسلامی حکومت اس قسم کے نظام کی ابتدا اپنے ہاں سے کرے گی۔ لیکن اس کے سامنے تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہوگی۔ اور اس کا ہر قدم اسی منتہیٰ کی طرف اٹھے گا۔

۱۴۔ قانون کے الفاظ اور حکومت کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو، اگر کوئی دستور مندرجہ بالا ضروریات کو پورا کرتا ہے تو وہ اسلامی دستور کہلائے گا اور اگر ان میں سے کوئی ایک شق بھی پوری نہیں ہوتی تو اس مملکت کا دستور غیر اسلامی ہوگا۔

اگر آپ ان اصولوں سے متفق ہیں تو مجلسِ آئین ساز کے اراکین میں سے ایک ایک کو لکھئے کہ وہ ان خطوط پر پاکستان کا آئین مرتب کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ان اصولی اشارات میں سے کسی کی مزید تشریح کی ضرورت ہو تو اس کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام ہر وقت حاضر ہے۔

اس میں نہ ہی مُلّائیت ہوگی

"پاکستان کی جد و جہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھے کہ کام کی نوعیت، تقسیمِ عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و مستعدی کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔"

(قائدِ اعظم سنہ ۱۹۴۱ء)

"گذشتہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ میں اسلام نے استبداد کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ ہوا یہ کہ ان مستبد حکمرانوں نے اسلام کو بطور ایک آلۂ کار کے استعمال کیا۔ مفاد پرست گروہ ان کے ساتھ تھا۔ اور مذہبی پیشوا (علماء) ملوکیت اور مفاد پرستی کے منشاء کے مطابق اسلام کی تاویلات کرتے جاتے تھے۔ اور چونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہی مذہب کے واحد ٹھیکیدار ہیں، اس لئے جو کچھ یہ کہتے ہیں وہی مذہب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر شخص خواہ وہ مولوی یا سرکاری دفتر کا ملازم یا کسی روک ٹوک کے از خود پڑھ سکتا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں، نہ ہی ہمارے ہاں پنڈتوں کا کوئی گروہ ہے اور نہ ہی اس قسم کا تصور کہ اس گروہ کے باہر باقی لوگ ذہنی طور پر اچھوت ہیں۔۔۔۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ اس ہزار سالہ عرصہ میں اسلام مستبد ملوکیت اور مفاد پرستانہ پیشوائیت کے جس ملبے کے نیچے دب چکا ہے اسے وہاں سے نکالا جائے۔۔۔ پاکستان میں اس قسم کی ملوکیت کی استبداد یا پیشوائیت کی خدائی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم حریتِ فکر و نظر کے قائل ہیں اور تمام انسانوں کے لئے زندگی کے ہر شعبے میں یکساں مواقع بہم پہنچانے کے حامی ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں میں ان بلند اقدار کی روح پھونک دیں جنہیں قرآن پیش کرتا ہے اور جن کے بغیر کوئی قیادت اخلاقی اور روحانی ترقی نہیں کر سکتی۔"

(گورنر جنرل مسٹر غلام محمد سنہ ۱۹۵۲ء)

مجلسِ اقبال

(شہرِ مرغدین)

ترتیب کے اعتبار سے اس اشاعت میں مثنوی اسرارِ خودی کی اگلی قسط سامنے آنی چاہیئے تھی لیکن چونکہ یہ پرچہ یومِ آزادی کی تقریب پر شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس میں پاکستان کے اس تصور کو پیش کیا جائے جو علامہ اقبال کی نگاہ میں تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ پاکستان، حضرت علامہ کی وفات کے بہت عرصہ بعد وجود میں آیا تھا۔ لیکن اس کا تصور انھوں نے الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت (۱۹۳۰ء) میں پیش کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب جاوید نامہ کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی سیرِ افلاک کی داستان بیان کی ہے۔ وہ اس سیر میں، فلکِ مریخ میں "شہرِ مرغدین" میں پہونچتے ہیں۔ جس طرح یہ شہر اور وادیاں تصوراتی ہیں، اسی طرح ان کے نام بھی حضرت علامہ کے خود ہی تراشیدہ ہیں۔ مرغدین کا نام اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ یہ اس سرسبز و شاداب بستی کا نام ہے جس کا نظام دین کی بنیادوں پر استوار ہے۔ بالفاظ دیگر حضرت علامہ نے اس میں یہ بتایا ہے کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں دین کے اصولوں پر معاشرہ قائم ہو جائے تو وہاں کی زندگی کا نقشہ کیا ہوگا۔ چنانچہ حضرت علامہ نے پاکستان کی تجویز ہی اس لئے کی تھی کہ یہاں کے رہنے والے مسلمان اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے مطابق بسر کر سکیں، اس لئے جو کچھ انھوں نے مرغدین کے متعلق کہا ہے۔ اس سے ان کا مقصود اس پاکستان کا معاشرتی نقشہ تھا جو اس زمانہ میں ان کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس داستان کا عنوان ہی انھوں نے "گردش در شہرِ مرغدین" تجویز کیا تھا۔ اس عنوان کے ماتحت وہ لکھتے ہیں کہ

مرغدین و آں عماراتِ بلند — من چہ گویم زاں مقامِ ارجمند

مرغدین کی وہ بستی ہے۔ جس میں بڑی بڑی سر بفلک عمارات ہیں۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ بستی کیسی ہے اور اس کا مقام کتنا بلند ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش — خوب رو و نرم خو و سادہ پوش

اس میں رہنے والوں کی زبان شہد سے بھی زیادہ میٹھی اور وہ خود نہایت حسین، خوش شکل، مزاج اور عادات کے اعتبار سے بہت نرم اور سادہ۔ اس حقیقت پر غور کیجئے کہ اس شہر کی عمارتیں تو بہت بلند بتائی گئی ہیں۔ لہٰذا ان کی سادگی سے یہ مقصود نہیں کہ وہ جھونپڑیوں میں بستے تھے یا وہاں راہبوں کی تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں۔ سر بفلک عمارتیں لیکن ان میں بسنے والے نہایت سادہ

فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب — رازدانِ کیمیائے آفتاب

وہاں فارغ البالی اور مرفع الحالی کی یہ کیفیت ہے کہ انھیں اکتسابِ معاش کے لئے کسی قسم کی کوئی پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی۔ یہ نہیں کہ وہ محض روٹی کے مارے مارے پھر رہے ہوں اور ان کی ساری زندگی انہی مشقتوں اور مصیبتوں میں بسر ہو جائے۔ ان کے دماغ معاش کی فکر سے بالکل آزاد ہیں۔ اور اس کے لئے انھیں جانکاہ مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن نے قصۂ آدم کے تمثیلی بیان میں کہا ہے کہ اے ابنائے آدم اگر تم وحی کے نظام کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ نظام کے مطابق زندگی بسر کروگے۔ تو یاد رکھو تمہیں زندگی کی بنیادی ضروریات کے لئے بھی جگر پاش مشقتوں میں سے گزرنا پڑے گا۔ اور یہ تمہاری نہایت بدبختی ہوگی اسی باب میں سورۂ طٰہٰ کی ۱۱۶ سے ۱۲۴ آیات کو دیکھئے جن میں آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۲۰/۱۲۳) جب خدا کی رہنمائی کے مطابق معاشرہ قائم ہوگا تو اس میں نہ کسی کی محنت رائگاں جائے گی اور نہ ہی اسے ضروریاتِ زندگی کے لئے پریشانیاں اٹھانی پڑیں گی۔

حضرت علامہ نے مرغدین کا یہی نقشہ پیش کیا ہے کہ اس میں

فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ زمانۂ قبل از تاریخ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جس میں نہ تہذیب تھی نہ تمدن۔ نہ علم تھا نہ سائنس بلکہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ

رازدانِ کیمیائے آفتاب

کہ وہ یہ زمین تو ایک طرف سورج کے اندر چھپی ہوئی قوتوں سے بھی واقف ہیں اور ان کا سارا کاروبار اسی توانائی (ENERGY) کے زور پر چلتا ہے جسے وہ آفتاب سے حاصل کرتے ہیں

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور — چوں نمک گیریم ما از آبِ شور

ان میں سے جس کسی کو چاندی یا سونے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے وہ آفتاب کی روشنی سے پوری کر لیتا ہے جس طرح ہم سمندر کے پانی سے نمک نکال لیتے ہیں لیکن وہاں چاندی اور سونے کی ضرورت سکوں کے طور پر استعمال کرنے کے لئے نہیں پڑتی۔ وہاں کوئی شخص اپنی خدمات کا معاوضہ روپیہ پیسہ میں نہیں چاہتا بلکہ

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کارہا ناکس نمی سنجد بزر

وہاں علم اور ہنر دونوں کا مقصد یہ ہے کہ ان سے خلقت کی خدمت کی جائے۔ نہ یہ کہ انھیں بیچ کر دولت کمائی جائے۔ کیونکہ دولت کمانا کسی کے پیشِ نظر ہی نہیں۔ اس لئے وہاں سکوں کا وجود ہی نہیں،

کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

وہاں کوئی جانتا ہی نہیں کہ دینار کسے کہتے ہیں اور درہم کیا ہوتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ درہم و دینار وہ بت ہیں جو باطل نظامِ زندگی کے تراشیدہ ہیں۔ جو نظام خدا کے قوانین پر مبنی ہو، اس میں ان معبودانِ باطل کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ صحیح نظامِ زندگی میں دولت جمع کرنے کا تصور ہی نہیں آ سکتا۔ اس لئے وہاں سکوں کی ضرورت کیا ہے؟

اوپر کہا گیا ہے کہ وہ لوگ سائنس میں اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ ان کے تمام کاروبار اسی توانائی کے زور پر چلتے ہیں جسے وہ سورج سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

بر طبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست — آسماں ہا از دخانش تیرہ نیست

نہ صرف یہی کہ ان کی فضا مشینوں کے دھوئیں سے پاک و صاف رہتی ہے۔ بلکہ ان کی طبیعتوں پر بھی ان کے غلبہ اور تسلط کا کوئی اثر نہیں ہمارا یہ زمانہ مشینوں کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری صنعت و حرفت میں مشینیں عام ہو گئی ہیں بلکہ یہ کہ بنیادی طور پر ہماری ساری زندگی میکانیکل ہو گئی ہے۔ اس دور میں خود انسان کو ایک مشین سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاتی اور باہمی معاملات اور برتاؤ میں بھی ایک فرد دوسرے فرد سے اسی طرح ملتا ہے جس طرح مشین کا ایک پرزہ دوسرے پرزہ کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اس سے زیادہ انھیں آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اسی مشینی اندازِ زندگی کا اثر اتنی دور تک چلا گیا ہے کہ میاں بیوی، باپ بیٹا، بہن بھائی تک میں بھی انسانیت کا رشتہ نہیں بلکہ محض مشینی رشتہ باقی رہ گیا ہے۔ مرغدین میں باہمی تعلقات کی یہ کیفیت نہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

سخت کوش دہقاں چراغش روشن است — از نہاب دہ خدایاں ایمن است

وہاں کا کسان بہت محنتی ہے۔ لیکن اس کی محنت مجبوری کی نہیں وہ اپنی خوشی سے محنت کرتا ہے اور بہت مرفع الحال ہے۔ اس کے گھر میں خوشی کے چراغ جلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں یہ صورت نہیں کہ زمیندار زمین کا مالک ہو اور کاشتکار زمین میں کھیتی باڑی کرے۔ کاشتکار سارا سال ہو پسینہ ایک کر کے فصل تیار کرے اور زمیندار اس کا حاصل لے جائے اور کاشتکار اس کے رحم و کرم پر ہو۔ نہ ہی وہاں یہ کیفیت ہے کہ پانی کی باریوں پر کسانوں کے لڑائی جھگڑے ہوں اور وہ تھانوں اور کچہریوں میں مصیبتیں بھگتتے پھریں۔

کشت و کارش بے نزاعِ آبجو است — حاصلش بے شرکتِ غیر از او است

وہاں پانی کی فراوانی ہے اور وہاں کا کسان اپنی محنت کے ماحصل کا آپ مالک ہے۔ اسے کوئی لوٹنے کھسوٹنے والا نہیں۔ یہ تو ہی معاشی زندگی جہاں تک سیاسی زندگی کا تعلق ہے

اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں

آپ غور کیجئے۔ آج دنیا کی بدترین لعنتوں میں سے ایک لعنت مستقل فوج (STANDING ARMY) کا وجود ہے۔ ابنائے قوم کا بہترین حصہ فوج میں لے لیا جاتا ہے۔ اور یہ لاکھوں نوجوان دوسروں کے پیدا کردہ رزق پر بہترین زندگی بسر کرتے ہیں۔ یعنی قوم میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے، اس کا بہترین حصہ سب سے پہلے فوج والوں کو دیا جاتا ہے اور خود فوج والے کسی قسم کے پیداواری کام کاج (PRODUCTIVE WORK) میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ اس کے علاوہ قوم کی دولت کا بہت بڑا حصہ ان آلات حرب و ضرب کے بنانے اور سنبھالنے میں صرف ہو جاتا ہے جو ایک فتیلا دکھلانے سے فضا میں بھک سے اڑ جاتا ہے قوم کے ان بہترین نوجوانوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو قتل کریں۔ انھیں یہ سب کچھ اسی کے معاوضہ میں ملتا ہے۔ حضرت علامہ کہتے ہیں کہ مرغدین میں اس قسم کی کوئی لعنت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا سے قومیتوں کے تنگ دائروں کو مٹا دیا جائے اور ذاتی ملکیت کے نظام باطل کو ختم کر دیا جائے، اور تمام نوع انسانی ایک گھرانے کی طرح زندگی بسر کرے، تو دنیا میں نہ فوجوں کی ضرورت باقی رہے نہ سامان حرب و ضرب کی۔ جو نظام قرآن کی بنیادوں پر قائم ہوگا۔ اس میں آخر الامر یہی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ تو تھا اہل سیف کا حال۔ باقی رہے اہل قلم سو

نے قلم در مرغدین گیرد فروغ از فن تحریر و تشہیر دروغ

مرغدین میں تحریر نے ایک فن کی شکل اختیار نہیں کر رکھی نہ ہی وہاں قلم سے جھوٹ کو عام کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ وہاں قلم کو ان امور کی نشر و اشاعت سے فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جو حق پر مبنی ہوں۔ اور جن سے مقصود نفع اندوزی نہ ہو۔ لہذا وہاں کے اخبارات و تصنیفات نوع انسانی کی خدمت کا موجب ہیں نہ کہ جھوٹ کو پھیلا کر فروغ حاصل کرنے کا ذریعہ

نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش نے صداہائے گدایاں درد گوش

ہمارے غلط معاشرہ میں ان لوگوں کا ایک مستقل طبقہ ہوتا ہے۔ جنھیں کام نہیں ملتا۔ یا جو کام کئے بغیر دوسروں کی محنت پر جیتے ہیں جو لوگ کام کاج میں مصروف رہتے ہیں انھیں اس کی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ ہنگامے برپا کرتے رہیں۔ اس لئے مرغدین میں ان ہنگاموں کا شور کہیں سنائی نہیں دیتا۔ جنھیں ہمارے ہاں بیکار لوگ برپا کرتے رہتے ہیں۔ نہ ہی وہاں کوئی بھک منگا نظر آتا ہے جس کی آواز درد گوش بنے۔

یہ تو تھا وہ نقشہ جو اقبال نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد حکیم مریخ نے ایک فقرہ میں یہ بتا دیا کہ مرغدین کے معاشرہ کا ماحصل کیا ہے یعنی

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس نے کہا کہ ہمارے ہاں کوئی شخص اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اس لئے کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور جب کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا تو پھر نہ کوئی کسی کا غلام ہوتا ہے نہ کوئی غلاموں کا آقا۔ حتیٰ کہ یہاں کوئی حاکم ہے اور نہ محکوم۔ خدا نے جو غیر متبدل قوانین عطا فرما دیئے ہیں سب اس کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کوئی انسان کسی انسان پر حکومت نہیں کرتا۔ یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہا اور یہی اسلامی دستور و آئین کا ماحصل و لب لباب ہے۔

یہ ہے نقشہ اس معاشرہ کا جس کے لئے حضرت علامہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک قطعۂ زمین مل جائے۔ ان کے ذہن میں نقشہ یہ تھا کہ اس قطعۂ زمین میں مسلمان قرآنی آئین کے مطابق معاشرہ قائم کریں اور اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہو جسے انھوں نے مرغدین کے معاشرہ کے نام سے تعبیر کر کے جاوید نامہ میں پیش کر دیا۔

*

علامہ اقبال نے اسی جاوید نامہ میں، علامہ جمال الدین افغانی کی زبانی بتایا ہے کہ حکومت الٰہی کے خط و خال کیا ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حکومت میں انسان صرف قوانین خداوندی کا محکوم ہوتا ہے۔ ایسے انسان کو بندۂ حق کہتے ہیں اور

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق مرد آزاد است و بس ملک و آئینش خداداد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

اس حکومت کے آئین و دستور کی بنیاد یہی وحی خداوندی پر ہوتی ہیں جو اپنی جگہ پر اٹل اور غیر متبدل ہے۔ وہاں تمام معاملات کے فیصلے اسی کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ بندۂ حق کی محبت بھی حق کے لئے ہوتی ہے۔ اور مخالفت بھی حق کے لئے۔ اس کے مقابلہ میں انسانوں کے خود ساختہ نظام کی بنیاد تنہا عقل پر ہوتی ہے اور عقل اور وحی میں فرق یہ ہے کہ

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر سود خود بیند نہ بیند سود غیر

وحی حق بینندۂ سود ہمہ در نگاہش سود و بہبود ہمہ

عقل صرف اس فرد یا اس قوم کے مفاد کو دیکھ سکتی ہے جس کی وہ عقل ہے۔ وہ اس کے سوا کسی دوسرے کے مفاد کا خیال نہیں رکھ سکتی۔ اس کے برعکس وحی کے قوانین چونکہ اس خدا کی طرف سے ملتے ہیں جو رب العالمین یعنی تمام نوع انسانی کو نشو و نما دینے والا ہے اس لئے اس کی نگاہ میں تمام انسانوں کا مفاد یکساں طور پر ہوتا ہے۔ لہذا جس نظام کی بنیاد وحی کے غیر متبدل قانون پر ہوگی۔ اس کا مقصود تمام نوع انسانی کی نشو و نما ہوگا۔ اور یہی حکومت الٰہی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

بندۂ حق میدان جنگ میں ہو یا صلح کی کانفرنس میں، ہر جگہ اس کے پیش نظر عدل و انصاف ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی پر ظلم کرتا ہے نہ اپنے آپ پر ظلم ہونے دیتا ہے۔ وہ کٹتا اس سے ہے جو حق کی مخالفت کرتا ہے اور اپنا رشتہ پیوست اس سے کرتا ہے جو حق کی حمایت کرتا ہے اس میں نہ وہ کسی کی رعایت کرتا ہے نہ وہ کسی سے خوف کھاتا ہے۔ یہی ہے وہ بنیادی حقیقت جو حکومت خداوندی کے اندر جلوہ بار ہوتی ہے۔ اسی قسم کی حکومت تھی جسے علامہ اقبال پاکستان میں متشکل دیکھنا چاہتے تھے۔ اور آج وہ شخص دیکھنا چاہتا ہے جس نے پاکستان کے حصول میں اس نقشہ کو پیش نظر رکھا تھا۔ طلوع اسلام اسی قسم کے نظام اور آئین کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اسی کو نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔

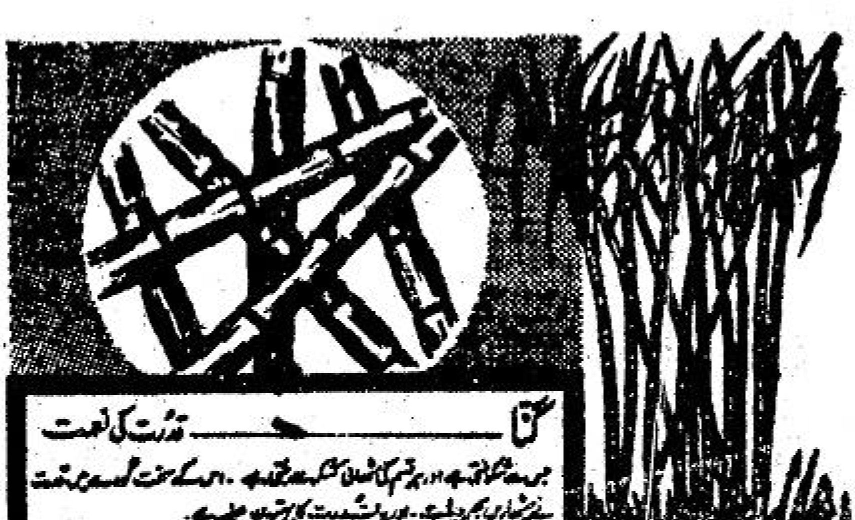

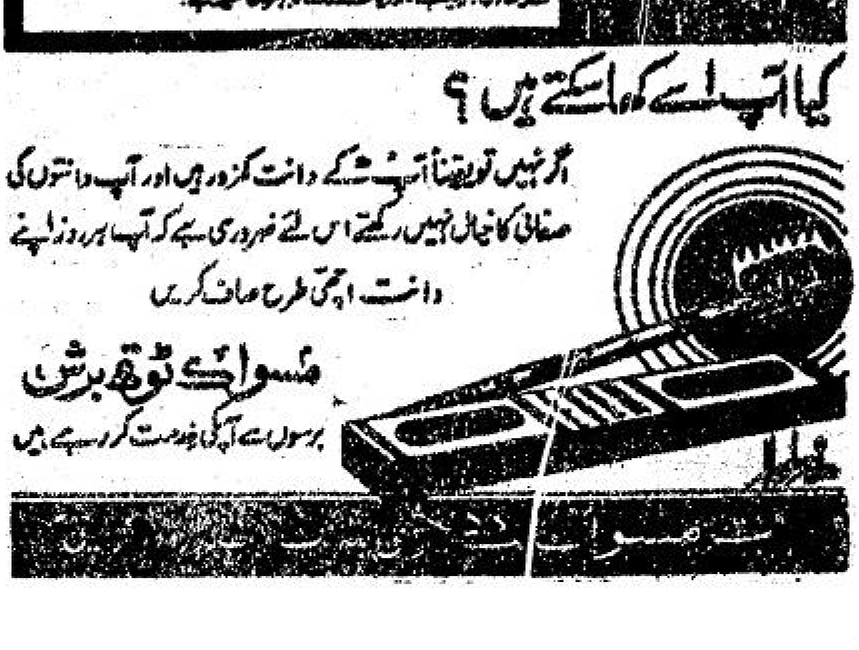

آزادی کے آٹھ سال

اقرأ کتابک کفٰی بنفسک الیوم علیک حسیبا (۱۷ : ۱۴)

حکیم الامت علامہ اقبال، تاریخ انسانی کے بالغ نظرانہ مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ

عالم بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو ..... بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں جب منشائے الٰہی شہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پا جائے۔

نیز

عالم بشری (کے لئے)..... سوائے نظام اسلامی کے کوئی اور واحد اجتماعی نظام ذہن میں نہیں ہو سکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالم بشری کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔

عالم بشری کے لئے قرآن پر مبنی واحد اجتماعی نظام کو بطور نصب العین سامنے رکھ کر آپ نے پہلا قدم اٹھایا۔ اور ایک ایسے خطے کے حصول پر زور دیا جو اس عالمگیر تجربے کے لئے بطور معمل کام دے سکے چنانچہ آپ نے ملت کے سامنے اس مملکت پاکستان کا تصور پیش کیا جس کا

اولیں مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔

انھوں نے یہ بھی واضح طور پر بتا دیا کہ

اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دار الکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے اور اس کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

مسلمانان برصغیر کی جو تقدیر اقبال کے کارگہ فکر سے نقش پذیر ہو کر نکلی تھی اس کے عملی حصول کے لئے جس تحریک کی ضرورت تھی اس کی قیادت کے لئے آپ کی نظر انتخاب قائد اعظم پر پڑی۔ چنانچہ مسلمانوں کی قسمت ان کے ہاتھ سونپنے سے پہلے انھیں آپ نے بتا دیا کہ

اس وقت حالت یہ ہے کہ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا کیا علاج ہو..... ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دور حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان نشو و نما دیا جا سکتا ہے

قائد اعظم بھی جنھیں اقبال نے مسلمانوں کی قیادت کے لئے منتخب کیا اور جنھوں نے پاکستان حاصل کر کے دکھا دیا یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی نجات ایسے نظام معاشرت میں ہے جو قرآنی اصولوں پر موسس ہو۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں آپ نے حیدر آباد میں فرمایا۔

میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی سیاسی، یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

یہ تھے وہ محرکات جنھوں نے مسلمانوں کو دنیا بھر کی مخالفت کے علی الرغم اس موقف پر قائم کر دیا کہ مسلمان بہ حیثیت مسلمان ملت واحدہ ہے۔ اور اسے اپنی معاشرت کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے ایک ایسے خطۂ ارض کی ضرورت ہے جو اجنبی اثرات سے یکسر پاک ہو اور جسے وہ آزادانہ قرآنی تعلیمات کا گہوارہ بنا سکیں۔ کتنی پاک تھیں یہ امنگیں اور کتنی حسین تھیں یہ آرزوئیں۔ شاید انہی کا صدقہ تھا کہ خلاف توقع اور دیکھتے دیکھتے کرۂ ارض کی سب سے بڑی اسلامی مملکت معرض وجود میں آ گئی۔ کتنی بڑی کامیابی تھی یہ۔ وہ قوم جو کوئی نو سے سال پیشتر دولت و حشمت سے اس قدر محروم کر دی گئی تھی کہ اس کی زندگی تک معرض خطر میں پڑ گئی تھی۔ اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اس امت کی اجل کا وقت آ پہنچا ہے وہی قوم ایک مملکت جدید کی مالک بن رہی تھی۔ ایسی مملکت کی مالک جس کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک دوسرے "مدینہ" کی تھی کہ یہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر اور تصورات کی تشکیل بے روک ٹوک اور بلا خوف و خطر کر سکتے تھے۔

قائد اعظم جو اس قوم کو ایک فرعون نہیں بلکہ متعدد فرعونوں کے چنگل سے نکال کر اس نئی دنیا میں امن و سلامتی میں لے آئے تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ چل بسے تو عجیب افراتفری کا دور شروع ہوا۔ اس گھر کی حالت بعینہٖ وہ ہو گئی جو ایک بزرگ کے اٹھ جانے کے بعد ناخلف اولاد کے ہاتھوں ہو جایا کرتی ہے۔ نام نہاد آزادی کی زندگی کو دیکھا جائے تو پاکستان قرون وسطیٰ کا وہ دربار نظر آتا ہے۔ جس میں بادشاہ کے مر جانے کے بعد سازشوں کا جال بچھ گیا ہو۔ اقتدار کی اس کشمکش سے خانہ جنگی کی وہ صورت پیدا ہوئی کہ مقاصد کی تکمیل تو ایک طرف سرے سے مملکت کی برقراری مخدوش نظر آنے لگی

حصول پاکستان کے بعد پہلا سوال پیدا ہونا چاہیئے تھا کہ جس قرآنی نظم معاشرت کے تجربے کے لئے اس خطۂ ارض کو حاصل کیا گیا ہے اس کا خاکہ کیا ہے اور اس میں کیسے رنگ عمل بھرا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک تو اس منفرد ملک کی پیدائش ہی نے اس کے لئے ایسے گوناگوں مخاطر پیدا کر دیئے کہ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ دوسرے قائدین پاکستان اہم امور سے ہٹ کر ذاتی اقتدار کے حصول میں منہمک ہو گئے۔ جس سے موانعات راہ ناقابل عبور بن گئیں۔ چنانچہ آزادی کے آٹھ سالوں میں ہمارے نام نہاد دستور سازوں نے مطلقاً یہ کوشش نہیں کی کہ اسلامی اصولوں کو مرتب و متشکل کریں۔ تاکہ ان کے مطابق مملکت کا دستور تیار کیا جا سکے ان کا از خود نہ کرنا شاید اس لحاظ سے قابل فہم تھا کہ وہ اس میدان کے مرد نہیں تھے۔ لیکن جو چیز بالکل ناقابل فہم اور ہر طرح ناقابل معافی تھی وہ یہ تھی کہ انھوں نے اقبال کے اس مکتب فکر سے ذرا بھی استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی جو قرآنی اصولوں کی تشکیل نو میں مصروف تھا اور ہے۔ اس مکتب ــــ یعنی طلوع اسلام ــــ نے اسلامی نظام اور قرآنی دستور پاکستان کو اس وضاحت سے مرتب کر کے ان کے سامنے پیش کیا کہ اس کی مثال سارے اسلامی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ اس بے مثل کاوش کے بے نظیر نتائج کو ہاتھ تک لگانا گوارا نہ کیا۔

جب آئین سازان پاکستان نے نور قرآنی کی تمام راہیں بند کر دیں تو رجعت پسندی، دقیانوسیت اور جہالت کی تاریکی پھیلتی گئی۔ اس فضا میں ملا آگے بڑھا۔ اس نے مذہبی تقدس کا رعب دے کر تمام لیڈروں کے عیب گنوائے اور خود مسند اقتدار کی طرف بڑھا۔ اسلام سے نابلد اور سیاسی ریشہ دوانیوں میں الجھے ہوئے ارباب اقتدار ملا کی پیش قدمی کو کہاں روک سکتے تھے۔ چنانچہ جب سنہ ۱۹۵۲ء میں بنیادی اصولوں سے متعلق سفارشات سامنے آئیں تو اس میں نہ محض سیاسی اعتبار سے ملکی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا تھا بلکہ قانون سازی کا آخری اختیار ملا کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ اس کے مطابق ملاؤں کی مجلس ہی یہ فیصلہ دے سکتی تھی کہ کوئی قانون اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ حالات یہاں تک بگڑ چکے تھے کہ گورنر جنرل مسٹر غلام محمد نے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا۔ انھوں نے ناظم الدین حکومت کو برطرف

کردیا جو نظم و نسق کے اعتبار سے ملک کو تباہی کے قریب تک لے آئی تھی اور مذہبی لحاظ سے ملّا کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

یہ اقدام مثبت نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ لیکن عملاً اس کی حیثیت سلبی رہی۔ اور اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نہ نکلی۔ اور وہ نکل بھی کیسے سکتی تھی۔ جب کہ اس کے لئے نہ آئین سازوں نے کبھی سوچنے کی کوشش کی تھی نہ انھوں نے سوچنے والوں کو ایسا موقعہ دیا تھا۔ بہرحال اس سے اتنا ہو گیا کہ ملّا کی تقیبی کل اقتدار کی شکل باقی نہ رہی۔ لیکن اس دوسرے دور میں آئین کا جو خاکہ سامنے آیا وہ بھی کم افسوسناک نہ تھا۔ اس میں آئین کو اسلامی بنانے کے لئے یہ شق داخل کی گئی تھی کہ کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جائے گا جو "کتاب و سنت" کے منافی ہو گا۔ یہ شق آئین سازوں کی بے فکری کی دلیل نہ تھی اس سے بھی ملّا کے داخلہ کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ کیونکہ جب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آئے گا کہ کوئی قانون "کتاب و سنت" کے مطابق ہے یا نہیں تو اس کے متعلق حتمی رائے ملّا ہی دے سکے گا۔ گویا اگر پہلی رپورٹ میں ملّا کو باقاعدہ مسند پر بٹھا دیا گیا تھا تو اس میں اسے ساتھ والے کمرے میں بھیج کر دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ جب چاہے اس پر متمکن ہو جائے۔

ارباب اقتدار نے جدید فکری عوامل کی سرپرستی سے جو ہاتھ روکا تو ملّا کے لئے میدان خالی ہو گیا۔ اس سے خود ارباب اقتدار کے لئے عجیب کشمکش پیدا ہو گئی۔ وہ ملّا کے پیش کردہ تصور کو ناقابل عمل سمجھتے تھے لیکن اپنے آپ میں اتنی جرأت نہیں پاتے تھے کہ اسے مسترد کر دیں۔ ان کی اس گومگو نے ملک کے نوجوان طبقے کو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کا ماڈرن ذہن ملائیت کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا لیکن ملائیت ہی کو اسلام سمجھ کر وہ اسلام سے منحرف ہونے لگے ہیں۔ چونکہ مذہب کا اثر بہت گہرا ہے اس لئے ہمارے نوجوان علانیہ "نامسلمان" نہیں ہوئے۔ لیکن نوجوانوں کے عام طبقہ کو ٹٹول کر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مذہب سے بیگانہ ہو رہے ہیں اور وہ گرمجوشی جو اسلامی نظام کے قیام کے لئے پائی جاتی تھی اب مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ گویا نہ محض نظام اسلامی کا واضح نقشہ مرتب نہیں کیا جا سکا بلکہ اس کے برعکس اس کے نفاذ کے خلاف بھی فضا پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ یہ ہے آئیڈیالوجی کی بنا پر مملکت کا قیام کرنیوالوں کی آٹھ سال کی کارگذاری!

کہا جا سکتا ہے کہ آئیڈیالوجی کے نفاذ میں ناکامی کی وجہ یہ ہو سکتی کہ وہ جس "انقلاب اندر شعور" کا متقاضی ہے وہ ہنوز پیدا نہیں ہو سکا لیکن یہ رونا تنہا آئیڈیالوجی کا نہیں۔ حیاتِ قومی کے کسی شعبے میں بھی کسی ابھار اور عروج کے کوئی آثار نظر نہیں آتے

سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ غالب کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے ہاتھ میں وہ جام نہیں جس کے بادہ جاں فزا سے "سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں"! پاکستان مسلم لیگ کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے یہ جماعت مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ ایک حد تک مسلم اور غیر مسلم کے مابین امتیاز کی دلیل بن گئی تھی۔ لیکن جب اس جماعت نے مملکت پاکستان کی عنان اقتدار سنبھالی تو سیاست میں دیکھتے دیکھتے وہ فساد رونما ہونا شروع ہو گیا کہ الامان والحفیظ۔ سیاست کا نقطۂ ماسکہ شخصی تفوق بن گیا جسے دیکھئے وہ دیوانہ وار اپنے لئے سمیٹ رہا ہے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ اس طرح مسلم لیگ مردہ ہو گئی اور سیاسی زندگی کا یہ حال ہو گیا کہ کوئی اور پارٹی اس کے مقابلے میں ابھر نہیں سکی۔ آج بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں کسی پارٹی کا وجود نہیں اور سیاست کا محور پارٹیاں نہیں بلکہ افراد ہیں۔ اس ہمہ گیر افراتفری میں کاروبارِ حکومت اور نظم معاشرت کا جو حشر ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" کا سرفروشانہ نعرہ لگانے والوں نے چند ہی سالوں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان بنا کر انھوں نے غلطی کی ہے۔ تاریخ میں شاید ایسی مثال ڈھونڈھے سے بھی نہ ملے کہ کوئی تحریک علیٰ رغم الفت کامیاب ہوا اور کامیاب ہو کر اپنی کامیابی پر کفِ افسوس ملے۔ یا کسی قوم کو آزادی ملے اور آزاد ہونے کے بعد وہ متاسف ہو کہ وہ آزاد کیوں ہو گئی۔

آزادی نے مسلمانوں کے سامنے ترقی اور تعمیر کی نئی راہیں کھول دی تھیں لیکن ان پر گامزن کرنے کے لئے جس ملی شعور اور اجتماعی عزم کی ضرورت تھی وہ عنقا تھے۔ چنانچہ کسی منصوبہ کے تحت متوازن ترقی کا سوال پیدا نہ ہو سکا۔ منصوبے بنتے ضرور رہے لیکن بے تدبیری اور فقدانِ عمل سے وہ فائلوں کی قبر میں دفن ہو جاتے رہے۔ محض حالات کے دباؤ سے بعض شعبوں میں ترقی ہوئی اور محیر العقول۔ صرف صنعتی ترقی کے شعبے کو دیکھا جائے تو یہ باور کرنا مشکل ہو گا کہ اتنی حیرت انگیز ترقی ہو چکی ہے لیکن اس کا جذبۂ محرکہ محض نفع اندوزی اور مفاد پرستی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترقی عجیب بے ہنگم طریق سے ہوئی ہے۔ یہ نہیں سوچا گیا کہ ملک کو کس چیز کی ضرورت ہے اور کس قدر ضرورت ہے۔ سوچا صرف یہ گیا کہ کس چیز میں زیادہ فائدہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ آج جب کہ پاکستان کئی مصنوعات میں خود کفیل بن چکا ہے اس کی معاشی ابتری میں کمی کے آثار نظر نہیں آتے۔ عوام کی قوتِ خرید بڑھ جانے کی کوئی خاطر خواہ شکل پیدا نہیں ہو سکی اور جسے قومی آمدنی کہا جاتا ہے وہ چند ہاتھوں میں محدود ہوتی جا رہی ہے۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ ملک کی مجموعی آمدنی بڑھ رہی ہے لیکن قوم غریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس بے ربط صنعتی ترقی نے ملک کے لئے ایک اور خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ نو دولت مند صنعت کار اپنی دولت کے زور پر سیاست اور حکومت پر چھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گویا ملک پہلے جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھا تو اب سرمایہ دار کے قبضے میں آ رہا ہے۔ یہ "انقلاب" عوام کے حکمرانوں کو ضرور بدل رہا ہے لیکن ان کی معاشی مشکلات میں کسی استواری کا سبب نہیں بن رہا۔ دیکھا جائے تو یہ نتیجہ بالکل قابل فہم تھا۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے

> زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں
> کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں
> میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود
> اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں
> کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

تقسیم ہند سے پہلے عشرہ کی سیاست ملی اور آزادی کے آٹھ سالوں کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانوں کے ضمیر میں کسی قسم کا انقلاب پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ تحریک پاکستان نے مسلمانوں کے سطحِ شعور پر ہلکا سا ارتعاش ضرور پیدا کر دیا تھا اور اس سے یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ اسی سے وہ "موجِ تند جولاں" بیدار ہو گی کہ

نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

لیکن اس سطحی ارتعاش کو قلبی تموج اور ہیجان میں بدلنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ آئیڈیالوجی کے مطابق مملکت بنانے اور چلانے کے دعویداروں پر اولین فریضہ یہ عائد ہوتا تھا کہ وہ تعلیم پر ایسی توجہ صرف کرتے کہ اس سے مقاصد کا شعور پیدا ہوتا اور قوم میں اس شعور کے ساتھ متعین منزل کی جانب رواں دواں جانے کے سامان پیدا ہوتے لیکن تعلیم سے مجرمانہ غفلت برتی گئی۔ کہنے کو سکولوں میں اضافہ ہوا، نئے کالج کھلے، یونیورسٹیاں قائم ہوئیں لیکن تعلیمی نظام کو آئیڈیالوجی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ جب خود قائدین میں آئیڈیالوجی کا شعور مفقود تھا تو وہ تعلیمی نصب العین کو کیسے صحیح سمت میں رکھ سکتے تھے۔ اس بے مقصدی اور بدنظمی کے نتائج رفتہ رفتہ ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ گو درسگاہوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اور بڑھ رہی ہے لیکن تعلیم کے قابل بچوں کی بڑی تعداد تنگیٔ جا کی وجہ سے ان میں داخل ہونے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ جو بچے سکولوں میں نہیں جا سکتے وہ گھر اور معاشرت دونوں کے لئے طرح طرح کی پریشانیوں کا باعث بنتے جا رہے ہیں۔ جو بچے داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی حالت بھی کم پریشان کن نہیں۔ ان کے لئے تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں اور تعلیمی معیار دن بدن گرتا چلا جا رہا ہے۔ سالانہ نتائج کے اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نتائج کا تناسب تدریجی طور پر کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس سال کے نتائج تو خصوصیت سے مایوس کن ہیں زیادہ سے زیادہ پچاس کے لگ بھگ تھا اور کم سے کم سترہ تک بھی پہنچ گیا۔ گویا آئیڈیالوجی کا شعور پیدا کرنا تو ایک طرف محض خواندگی کا تناسب بڑھانے کے لئے بھی قابل ذکر سرگرمی نہیں دکھائی جا رہی۔

المختصر یہ ہے ہماری ملی حیات کا نقشہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بڑا ہی مایوس کن ہے۔ لیکن اس سے حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ افراد تو گھبرا کر خودکشی کر سکتے ہیں قومیں خودکشی نہیں کر سکتیں یہ عملاً ناممکن ہے۔ لہٰذا آئیے سوچیں کہ

پس چہ باید کرد!

یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ آٹھ سال میں ہم قدم قدم پر مات کھاتے رہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نتیجہ ہے ہماری غلط روش زندگی کا نتیجہ بھی کہ ہم جس آئیڈیالوجی کو لے کر چلے تھے اسے ہم نے کبھی بھی نہیں آزمایا۔ لہٰذا جہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اب تک ناکام ہوئے وہاں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ یہ ناکامی ہماری آئیڈیالوجی کی ناکامی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہماری آئیڈیالوجی ناکام نہیں ہوئی بلکہ ابھی اسے آزمایا ہی نہیں گیا تو اس آئیڈیالوجی کو ابھی

طرح سمجھئے اور اسے عملاً زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ اور رائج کیجئے ہماری خوش بختی ہے کہ ہماری آئیڈیالوجی بالکل محفوظ حالت میں قرآن میں موجود ہے۔ گویا ہم نے کچھ کھویا نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کو ضابطہ حیات بنائیں اس کے لئے قومی عزم کی ضرورت ہے۔ ہم میں آج تک اس عزم کا فقدان رہا ہے۔ قومیں اس سے محروم ہو کر موت سے ہمکنار ہو جاتی ہیں اور جب اس دولت کو پالیتی ہیں تو ان کی موت زندگی سے بدل جاتی ہے۔ اسی صدی کی کئی قابل تقلید مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جاپان، روس، جرمنی، ترکی اسی طرح پستیوں سے ابھرے اور انہوں نے زندہ قوموں کی صف میں ممتاز جگہیں حاصل کرلیں۔ ہم جس قدر ذلت میں گرے ہیں وہ اپنے اعمال کی بدولت ہے اور اپنے اعمال کے زور پر ہم بام عروج پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارا ابھرنا زیادہ یقینی ہے کیونکہ ہم میں قرآن موجود ہے جو انسانیت کے لئے واحد ضابطہ حیات ہے۔

بہ حیثیت مسلمان، ہماری حیات ملی کے لئے بنیادی اسباب میں سے دو ہی چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک ہماری بے مثل و بے نظیر آئیڈیالوجی اور دوسرے وہ خطہ زمین جس میں آئیڈیالوجی کو نافذ کیا جا سکے۔ ہماری آئیڈیالوجی (قرآن) تو شروع سے محفوظ چلا آرہا ہے اور محفوظ رہے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ خطہ زمین جسے ہم نے اس کے لئے حاصل کیا وہ بھی ابھی تک محفوظ ہے۔ اگرچہ متعدد تخریبی قوتوں کا یہ عالم رہا اور اب تک ہے کہ دل غالب سے معذرت کے ساتھ

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
خواہم کہ دگر تبکدہ سازند حرم را

سو جب قرآن اور یہ خطہ زمین ہمارے پاس محفوظ ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ آج ۱۴ راگست ۱۹۵۵ء نہیں بلکہ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء ہے۔ لہٰذا اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر آپ صحیح خطوط پر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کلمے سے کر سے آغاز کر دیجئے۔

وقت آنست کہ آئین دگر تازہ کنیم
لوح دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

اور —

تیرا بھی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش — قیمت — بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصہ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۔۔ صفحات — قیمت — آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات — قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات — قیمت — دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ۔ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات — قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات قیمت — چار روپے

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات — قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے مضامین جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سسکتی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات — قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت — چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد — چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۶ صفحات — قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات — قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ — قیمت دو روپے

نظام ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دور حاضر کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔ قیمت قسم اول — چھ روپے قسم دوم — (غیر مجلد) — چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ دست کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ — قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۴۳۔ کراچی

مطبوعات طلوع اسلام کی شرائط ایجنسی

شرح کمیشن

معراج انسانیت — ۲۵ فی صدی، دیگر مطبوعات ۳۳ فی صدی
(۲) قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائیگی۔ (۳) فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی۔ (۴) پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم کی نہیں ہونی چاہیئے۔ (۵) ہر آرڈر کے ہمراہ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے۔ ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی

نوٹ۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملہ طے کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام پوسٹ بکس نمبر ۳۱۴۳ کراچی

پروفیسر ٹوئن بی سے چھ سوالات

پروفیسر ٹوئن بی (Toyn bee) علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی ساری عمر تہاذیب عالم کی تحقیقات اور مطالعہ میں گذری ہے اور اس کی زندہ شہادت ان کی وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جو (A study of history) کے عنوان سے دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ آپ اس کے مرکزی خیال سے خواہ متفق ہوں یا نہ ہوں، یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے اس دور کا جو ترکہ آنیوالی نسلوں کی طرف منتقل ہوگا، اس میں یہ کتاب ضرور شامل ہوگی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے اسپنگلر کی بلند پایہ کتاب (Declin of the west)

بھی اسی موضوع پر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کی اہمیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی، لیکن ٹوئن بی کا افق بہت وسیع اور اس کی نگاہ مقابلتاً کشادہ ہے۔ انہی پروفیسر ٹوئن بی سے پچھلے دنوں نیویارک ٹائمز کے نمائندے نے عند الملاقات چھ سوال پوچھے۔ یہ سوال اور ان کے جواب "ریڈرز ڈائجسٹ" کی جون ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر انہیں ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

پہلا سوال تہذیب مغرب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ فنا ہو جائے گی یا باقی رہے گی۔

جواب میں کبھی ناامید نہیں ہوا کرتا۔ میرا خیال ہے کہ تہذیب مغرب کو نہ زوال آئیگا اور نہ ہی یہ فنا ہوگی۔ اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے یہ مطلب نہیں کہ یہ خود بخود آگے بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جائیگی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ چیز ہم اہل مغرب کے امکان میں ہے کہ ہم کوشش کرکے اپنی تہذیب کو بچا سکتے ہیں۔ مجھے اس کی توقع ہے کہ وہ تخریبی قوتیں جو آج ہمارے سامنے آ رہی ہیں، ہم میں ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیں گی جس سے ہم اپنی غلط روش سے تائب ہو کر اپنی اصلاح کریں گے اور زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر چل پڑیں گے۔

طلوع اسلام سوال یہ ہے کہ اگر تہذیب مغرب ایک متاع عزیز ہے تو پھر اس سے تائب ہو کر ایک نئی روش پر چلنے کے معنے کیا ہیں؟ جب ہم موجودہ روش سے تائب ہو کر ایک نئی روش پر چل نکلے تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ ہمارے موجودہ تہذیب کا مستقبل شاندار ہے۔ اس تہذیب کو تو ہم نے اس دن چھوڑ دیا جب ہم ایک نئی شاہراہ پر چل پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی تہذیب میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ انسانی امن اور فلاح کی ضامن بن سکے۔ اس کی بنیادی کمزوریاں یہ ہیں کہ وہ۔

(۱) نوع انسان کی عالمگیر برادری کے تصور کے بجائے قومیت کے تنگ دائروں میں گھری ہوئی ہے۔ ان دائروں میں مسلسل تصادم کا موجود رہنا ناگزیر ہے۔

(۲) اس کے پاس کوئی غیر متبدل اصول ایسے نہیں جن پر ہر حالت میں عمل پیرا رہنا اہل مغرب کا ایمان ہو۔ نتیجہ یہ کہ ان اقوام کے فیصلے ان کی مصلحتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

(۳) یہ تہذیب خدا کے "قانونِ مکافاتِ عمل" پر ایمان نہیں

طلوع اسلام

رکھتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قوم اتنی قوت فراہم کر لیتی ہو کہ اسے دوسری قوموں کی مخالفت کی پرواہ نہ رہے، وہ بلاتامل سب کچھ کرتی چلی جاتی ہے۔

ہمارا یہ منہ تو نہیں کہ ہم اہل مغرب کو ان کی کسی روش پر ٹوکیں۔ اسلئے کہ ہم تو اپنی زیست تک کیلئے ان کے محتاج ہیں لیکن قرآن کی دی ہوئی بصیرت کے ماتحت ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جس تہذیب کی بنیاد خدا کی متعین کردہ غیر متبدل اقدار پر نہ ہو، اسکی تقدیر میں فلاح اور بقا نہیں ہو سکتی۔

دوسرا سوال کیا روس اور جمہوری اقوام مغرب سفر زندگی میں دوش بدوش چل سکتے ہیں۔

جواب جی ہاں۔ تاریخ کا تجربہ ہمیں ایسا ہی بتاتا ہے۔ سترھویں صدی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کا خیال یہ تھا کہ جبتک دوسرا فرقہ ختم نہیں ہو جاتا ان کے لئے جینا ناممکن ہے۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے زمانے میں ایسے عیسائی اور مسلمان موجود تھے جنکا خیال یہ تھا کہ جبتک دشمن کے مذہب کو نیست و نابود نہ کر دیا جائے ہماری بقا محال ہے۔ بایں ہمہ صدیاں گزر گئیں ہیں اور یہ فرقے اور گروہ بدستور موجود ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ روس اور جمہوری اقوام کو دوش بدوش رہنے میں کچھ ناگواری بھی ہوگی اور خطرات بھی لیکن یہ اسی وقت تک ہوں گے جب تک ہم یہ سمجھتے رہیں کہ ہمیں مجبوراً ایک دوسرے کے ساتھ چلنا ہے۔ لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک تیسری عالمگیر جنگ نہ ہونے پائے تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور باہمی اعتماد بھی پیدا کریں۔ دوراندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ایسی راہیں نکالیں جن سے ہمیں ان مسائل کے حل ملیں جن سے آج روس اور جمہوری قومیں دونوں کو واسطہ پڑ رہا ہے، ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

طلوع اسلام اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں مختلف نظریات زندگی رکھنے والی قومیں دوش بدوش چلتی رہتی ہیں لیکن فطرت کا اٹل قانون یہ ہے کہ بقا اسی نظام کے حصہ میں ہے جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷) فطرت کا اٹل فیصلہ ہے۔

تیسرا سوال وہ اہم مسائل حیات کیا ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

جواب سب سے پہلی چیز یہ کہ ہم تیسری جنگ عظیم کو کس طرح سے روک سکتے ہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اگلا سوال یہ ہے کہ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کی حد بندی کیسے کی جائے۔ صحت کے متعلق حفاظتی تدابیر کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی آبادی اس سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ یہ خطرہ ہے کہ ایک دن پوری نوع انسان بھوک سے نہ مر جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم افزائش نسل کے متعلق اپنی ذہنیت میں جلد سے جلد تبدیلی پیدا کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس قسم کی عائلی زندگی ہم بسر کر رہے ہیں اس میں یہ مشکل ہے کہ ہم اپنی عادات کو جلدی سے بدل لیں۔ یعنی یہ مشکل نظر آتا ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں کے ذہن میں یہ بات آ سکے کہ بچوں کی تعداد کا مسئلہ ایسا ہے جس میں باہر کی دنیا والے بھی دخل اندازی کا حق رکھتے ہیں، اس لئے کہ ان بچوں کی غذا اور سامان پرورش کا انتظام تو انہی باہر والوں نے کرنا ہے۔

اگر ہم نے جنگ کو روک دیا اور افزائش نسل پر بھی پابندیاں عائد کر دیں، تو اس کے بعد تیسرا اہم سوال مذہب کے احیاء کا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسان آزادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اس کی روحانی زندگی کا دائرہ ایسا ہے جس میں اسے سب سے زیادہ آزادی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا آنیوالی دنیا کا جو نقشہ سامنے آ رہا ہے اس میں شائد مذہب کا میدان ہی ایسا ہوگا جس میں انسان کو آزادی حاصل ہوگی۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آجکل تین قوتیں ایسی ہیں جو آزادی کے خلاف برسر پیکار ہیں اور ہمارے معاشرے کو آمریت کی طرف لئے جا رہی ہیں۔ یعنی بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ۔ نئے نئے آلات حرب اور عمرانی عدل کا تقاضا۔ جہانتک سیاست اور معیشت کا تعلق ہے یہ نظر آتا ہے کہ فرد کی آزادی دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم نے مذہب کے معاملہ میں بھی آزادی کو برقرار نہ رکھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آزادی دنیا سے بالکل معدوم ہو جائے گی۔ اور اگر آزادی ہی معدوم ہو گئی تو پھر انسان انسان نہیں رہے گا۔

طلوع اسلام حیرت ہے کہ پروفیسر ٹوئن بی نے قومیت اور رزق کی صحیح تقسیم کو ان اہم مسائل میں شمار نہیں کیا جو امن عالم کے لئے اس قدر خطرہ کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ افزائش نسل پر پابندیوں کا خیال بجا اور درست لیکن جب تک دنیا کا نظام "رب العلمین" کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا ہمارا کوئی

مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ "ربّ العٰلمین" کا تصور ہی ہمیں صحیح آزادی بھی دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی رو سے معاشرہ، حکومت یا نظام کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما کرے۔ یعنی اس نظام میں فرد کو معاشرہ کی قربانگاہ پہ بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا بلکہ معاشرہ فرد کی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔

چوتھا سوال اگر مذہب کا احیاء نہ ہوا تو مغرب پر اس کا کیا اثر پڑیگا۔

جواب اگر ایسا نہ ہوا تو مغرب کا مستقبل خوش آئند نہیں ہوسکیگا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے مغربی انداز زندگی میں فرد کی تقدیس کو اہمیت حاصل ہے۔ کمیونزم انسانی ذات کی قدر و قیمت سے انکار کرتی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ فرد صرف جماعت کے لئے ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اپنے مغربی خصوصیات کو برقرار رکھنا ہے تو اسے محکم بنیادوں پر قائم کرنا ہوگا۔ اسکی اصلی بنیادیں مذہب ہی پر قائم تھیں۔ ہم اہل مغرب کے دلوں میں فرد کی تقدیس کا جو تصور موجود ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ یہودی اور نصاریٰ دونوں کے ہاں یہ عقیدہ موجود تھا کہ خدا کی نگاہوں میں انسانی ذات کی ایک مطلق قدر موجود ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر مذہب نہ رہے تو ہمارا یہ عقیدہ اور کس بنیاد پہ قائم رہ سکیگا؟

طلوع اسلام اس میں شبہ نہیں کہ انسانی ذات کے تقدس کا تصور وہ محور ہے جس کے گرد امن اور فلاح کا پورا نظام گھومتا ہے لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ تصور یہودیت یا عیسائیت کا عطا فرمودہ ہے۔ یہودیت ہر بنی آدم کو نہیں بلکہ صرف بنی اسرائیل (بلکہ ان میں بھی صرف دو خاندانوں) خدا کی چہیتی اولاد قرار دیتی ہے۔ باقی رہی عیسائیت، سو اسکا عقیدہ یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتاً گناہگار ہوتا ہے۔ نیز وہ بھی غیر اسرائیلیوں کو عزت و تکریم کا مستحق نہیں سمجھتی کیونکہ انجیل کے بیان کے مطابق حواریوں کو تعلیم یہ دی گئی تھی کہ بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہ ڈالو۔ یہ عظیم اعلان آپ کو قرآن ہی میں ملیگا کہ "ولقد کرمنا بنی آدم" ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

پانچواں سوال کیا ہمارا موجودہ دور ایٹم بم اور کمیونزم جیسی بے مثل چیزوں کی رو سے ایک منفرد دور نہیں ہے؟

جواب ایٹم بم انسانوں کی تباہی کے لئے پہلا آلۂ جنگ نہیں۔ یہ تو اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں اس سے پہلے بارود اور ہوائی جہاز آچکے ہیں۔ نہ ہی موجودہ اشتراکی حکومتیں وہ پہلی حکومتیں ہیں جنھوں نے کسی خاص آئیڈیالوجی یا مذہب کو شمشیر کے زور پر پھیلانے کا مسلک اختیار کیا ہو۔ جس بات میں ہمارا زمانہ منفرد ہے وہ یہ ہے کہ جس نوعیت کی لڑائی اب لڑی جاتی ہے اس سے پہلے کبھی نہیں لڑی جاتی تھی۔ اس سے پہلے لڑائی کا مفہوم یہ تھا کہ ایک سپاہی میدان جنگ میں خطرات کو مول لیکر یا اپنی جان دیکر ان چیزوں کی محافظت کرتا ہے جو اس کے پیچھے ہیں۔ لیکن ایٹم بم نے میدان جنگ اور سول آبادی کی تفریق ہی کو مٹا دیا ہے۔ اب تو جنگ سے مراد عالمگیر تباہی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ ہمارے ذرائع رسل و رسائل اسقدر ترقی کر گئے ہیں کہ ہم نے گویا فاصلہ کے تصور ہی کو مٹا دیا ہے۔ فاصلہ کے تصور کو مٹانے سے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پوری نوع انسان ایک خاندان کی شکل اختیار کرلے لیکن ہم نے ایسا کرنے کے بجائے اس چیز کو خود اپنی تباہی کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے جس میں اگر ہم چاہیں تو تمام نوع انسانی ایک خوشحال برادری کی طرح بھی رہ سکتی ہے اور یا سب کے سب موت کے گھاٹ اتارے جاسکتے ہیں۔

طلوع اسلام ظاہر ہے کہ تمام نوع انسانی ایک برادری کی شکل اسوقت اختیار کرسکتی ہے جب قوموں کے موجودہ دائرے مٹ جائیں اور انسانیت کی تشکیل ایک عالمگیر آئیڈیالوجی پر ہوجائے۔ قرآن ایک ایسے ہی نظام کا عملی تصور پیش کرتا ہے۔

چھٹا سوال کیا آپ کا خیال ہے کہ مستقبل کمیونزم کے ہاتھ میں رہیگا۔

جواب نہیں میرا ایسا خیال نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ کمیونزم آخرکار انسانوں کے لئے جاذب نگاہ بننے میں ناکام رہ جائے گی۔ اس لئے کہ انسانوں کی انفرادی مشکلات اور ذاتی تکالیف میں جس روحانی سہارے یا رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے کمیونزم میں وہ چیز نہیں۔ مجھے کسی ایسے مذہب یا آئیڈیالوجی کا علم نہیں جو انسانوں کی مشکلات میں سہارا نہ بہم پہنچاتی ہو اور اس کے باوجود وہ ان کے نزدیک جاذب نگاہ ہو۔ ان وجوہات کی بنا پر میرا عقیدہ یہ ہے کہ مستقبل کمیونزم کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس مذہب کے ہاتھ میں ہے جو انسان کو انفرادی مصائب میں روحانی سہارا دے سکے۔

لیکن اس عقیدہ کو عام کرنے کے لئے ہمیں بڑی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ کمیونزم ایک بہت بڑی تحریک ہے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ ہم اس انتظار میں خاموش بیٹھے رہیں کہ ایک دن نوع انسانی کے سامنے کمیونزم کا پردہ خودبخود چاک ہوجائے گا اور یہ اس سے متنفر ہوجائے گی۔

اگر ہم نے سعی بلیغ کی تو ہم انسانوں کو صحیح راستہ پر لانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ میرا عقیدہ ہے کہ . . . .

ہمارا ایمان صداقت پر مبنی ہے اور صداقت میں وہ قوت ہوتی ہے کہ وہ آخرالامر کامیاب جاتی ہے۔

طلوع اسلام آپ غور کیجئے کہ تاریخ کے اتنے بڑے مبصر نے اس مقام پر کتنی بڑی غلطی کھائی ہے۔ کمیونزم تو پیدا ہی اسلئے ہوئی ہے کہ جو مذہب انسانوں کے سامنے تھا وہ انکی مشکلات اور مصائب کا صحیح اور عملی حل پیش کرنے کی بجائے انھیں محض "روحانی سہاروں" پر جینے کی تلقین کرتا تھا۔ یہ سہارے صرف عقیدت کی بنیادوں پر قائم رہ سکتے تھے۔ جب انسانوں نے دیکھا کہ وہ سہارے

۴۴

ان مشکلات کا صحیح حل پیش نہیں کرتے تو انھوں نے ان سہاروں کو چھوڑ دیا اور کمیونزم کے آغوش میں چلے گئے۔ کمیونزم کا توڑ اس نظام زندگی کے اندر ہے جو افراد انسانیہ کی تکالیف اور مصائب کا صحیح حل پیش کرے۔ یعنی ایسا نظام جس میں فرد کے سامنے کوئی ایسی تکلیف اور مصیبت آئے ہی نہیں جس کے دور کرنے کی ذمہ داری تنہا اس پر ڈال دی گئی ہو۔ قرآن ایک ایسا عملی نظام پیش کرتا ہے جو نوع انسانی کو ایسا سہارا دیتا ہے جو محض ذہنی اور تصوراتی نہیں ہوتا بلکہ ان کی مشکلات کا حقیقی علاج بنتا ہے۔ پروفیسر ٹوئن بی کے ذہن میں مذہب کا وہ تصور ہے جسے عیسائیت نے پیش کیا۔ یہ اس تصور مذہب کی ناکامی ہی تو ہے جس نے کمیونزم کو جنم دیا ہے۔ لہٰذا اس کے احیاء سے کمیونزم کا مقابلہ کیسے ہوسکے گا؟ کمیونزم کا مقابلہ صرف قرآنی نظام ربوبیت کرسکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے مغرب کا تحت الشعور قبول نہیں کرسکتا کیونکہ اس میں خود ان کے نظام سرمایہ داری کی بھی تو نفی ہوتی ہے۔

باب المراسلات

فکری صلاحیت کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے فکری صلاحیت کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس میں حالات کا نہایت صحیح تجزیہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات پھر بھی حل طلب رہ جاتی ہے کہ قوم فکر سے کام کیوں نہیں لیتی۔ میرا خیال ہے کہ فکر ایک مجرد صلاحیت کا نام ہے۔ جب تک کسی کے سامنے کوئی معاملہ ایسا نہ ہو جس پر فکر کرنے کی ضرورت ہو وہ اپنی فکری صلاحیت کو بروئے کار لا ہی نہیں سکتا۔ قوم کے افراد اپنے اپنے انفرادی معاملات کے متعلق بہرحال سوچتے ہیں۔ لیکن جس بات میں یہ فکر سے کام نہیں لیتے وہ ملت کے اجتماعی معاملات ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے سامنے ملت کا کوئی اجتماعی مقصد متعینہ طور پر ہے ہی نہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی متعینہ مقصد ہو تو یہ اس کے متعلق ضرور غور و فکر سے کام لیں۔ اصل یہ ہے کہ ہم میں پاکستانی ہونے کا شعور پیدا نہیں کیا گیا، یا کم از کم بیدار نہیں ہوا۔ ہم نے پاکستان بنا لیا ہم نے ایک مملکت بھی قائم کرلی۔ لیکن اسکے باوجود ہم اب تک پاکستانی نہیں بن سکے۔ معلوم نہیں آپ اس سے متفق ہونگے یا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ غیر شعوری طور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حصول پاکستان کی تحریک کے دوران میں جو نعرہ بلند کیا وہ قومی دائرہ سے بہت وسیع اور بلند تھا یعنی ہمارا دعوی یہ تھا کہ قوم وطن کے حدود سے تشکیل نہیں ہوتی بلکہ آئیڈیالوجی کی وحدت سے بنتی ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ ایک حقیقت تھی، اور بہت بڑی حقیقت۔ لیکن معاف فرمائیے اگر میں یہ عرض کروں کہ ہم اس آئیڈیالوجی کی بنا پر قوم نہیں بن سکے۔ اس سے نیچے اتر کر دوسری چیز یہ تھی کہ ہم اپنے

وطنِ پاکستان کی بنیادوں پر ایک قوم بن جاتے۔ لیکن ہم اس بنا پر بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ غالباً اسلئے کہ ہمیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ شرم سی آتی ہے کہ ہمارا دعویٰ تو یہ تھا کہ قوم آئیڈیالوجی کی بنا پر بنتی ہے اور اب ہمارا عمل یہ ہے کہ ہم وطنیت کی بنا پر قوم بنا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سینے سے اس کشمکش کو دور کر دینا چاہئیے۔ جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے ہماری ملت آئیڈیالوجی ہی کی بنا پر وجود میں آتی ہو لیکن جسطرح اس نصب العین کو ایک موثر حقیقت بنانے کے لئے ایک جماعت کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔ اسی طرح اسے عمل میں لانے کیلئے اس کا آغاز ایک قطعہ زمین ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر اگر اس قطعہ زمین میں بسنے والے اپنے آپکو ایک ملت سمجھ لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز دین کے خلاف نہیں جائیگی؛ بشرطیکہ ہم اس بلند نصب العین کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں دین کی جگہ سطحی مذہبیت نے لی ہے جو عوام کے جذبات سے کھیلتی ہے۔ ان لوگوں نے بھی "دستور اسلامی" کے مسلسل نعروں سے ذہنوں میں ایسا انتشار پیدا کر دیا ہو کہ قوم کے سامنے کوئی قومی نصب العین رہا ہی نہیں جس کیلئے وہ اپنی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ قوم سے کہا یہ جاتا ہے کہ "اسلامی دستور" کوئی ایسی چیز نہیں جو غور و فکر سے وجود میں لائی جائیگی بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو صدیوں پہلے وجود میں آگئی تھی اب وہ بنی بنائی شکل میں پاکستان میں نافذ کر دی جائے گی۔ لہٰذا قوم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمارا نصب العین "اسلامی دستور" کا نفاذ ہے اور اسلامی دستور ایک ایسی چیز ہے جو غور و فکر کی محتاج نہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ غور و فکر کی محتاج نہیں بلکہ اس میں عقل و فکر کی دخل اندازی کفر کے مرادف ہے۔

میرا خیال ہے کہ جب تک ان الجھاؤ پیدا کرنے والے مسائل کو بالکل صاف نہیں کیا جائیگا، قوم فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے قابل نہیں ہو سکیگی۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ قوم میں فکری صلاحیت تو موجود ہے لیکن ان کے سامنے کوئی ٹھوس مقصد ایسا نہیں رکھا گیا جسکے متعلق یہ فکر سے کام لیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ طلوع اسلام نے ہمیں سطحی جذبات کی خود فریبیوں اور خوش فہمیوں میں مبتلا رکھنے کے بجائے ٹھوس حقائق پر غور و فکر کرنا سکھایا ہے۔ اسلئے ہم سمجھتے ہیں کہ طلوع اسلام کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اہلِ پاکستان میں قومی شعور کو بیدار کرے تاکہ قوم اجتماعی مفاد پر غور و فکر کرنے کی عادی بن جائے۔

طلوع اسلام

ہمیں خوشی ہوئی کہ محترم مستفسر نے ایسے سلجھے ہوئے انداز میں اس اہم مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ہم اس سے حرف بحرف متفق ہیں کہ اس وقت اہلِ پاکستان کے پیش نظر کوئی متفقہ ٹھوس نصب العین ایسا نہیں جسے وہ اپنے لئے مرجعِ فکر سمجھیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان جغرافیائی حدود ہی سے متعین ہوا ہے۔ اس خطہ زمین کی اپنی مملکت ہے جو ہر اس مملکت سے الگ ہے جو اس خطہ زمین سے باہر ہے۔ اس کے بسنے والے پاکستانی ہیں۔ لہٰذا ان میں پاکستانی ہونے کا شعور پیدا ہونا کسی طرح بھی دین کے خلاف نہیں قرار پا سکتا بشرطیکہ یہ چیز اس عالمگیر آئیڈیالوجی کے متصادم نہ ہو جسے دین نے پیش کیا ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے پاکستان کے تحفظ کا سوال ہو تو ہمیں اس تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے لیکن اس کوشش میں ایسا کبھی نہیں ہونا چاہئیے کہ کسی دوسری قوم پر ظلم اور زیادتی ہو جائے۔ یا ہم اس جغرافیائی دائرہ میں گھر کر دنیا کے باقی مسلمانوں کو اپنے سے غیر سمجھنے لگ جائیں اور ان کی تباہی اور بربادی سے اپنی تقویت کا سامان بہم پہنچائیں۔ اس قسم کی شرائط کے ساتھ ہم میں اگر پاکستانی ہونے کا شعور پیدا ہو جائے تو یہ چیز پاکستان کے استحکام کا موجب بنے گی اور ہمارے لئے خیر و فلاح کا موجب۔

لیکن جس مقصد کے لئے آپ وحدت شعور کے متلاشی ہیں وہ اتنے سے حاصل نہیں ہو سکیگی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان میں وہ معاشرہ قائم کیا جائے جس کے لئے یہ وجود میں آیا ہے۔ یعنی یہاں نظام ربوبیت قائم کیا جائے۔ اسکی طرف عملی قدم اٹھ جائے تو پھر آپ دیکھئے کہ کسطرح پوری کی پوری قوم یک رنگ و ہم آہنگ ہو کر اجتماعیت کے رشتے میں پروئی جاتی ہے۔

باقی رہی سطحی مذہبیت سو اس کے متعلق ہم اس سے زیادہ اور کیا کہیں کہ اس نے ہمیں نہ دین کا رکھا ہے نہ دنیا کا۔۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے

فقیہہ و شاعر و صوفی کی ناخوش اندیشی

ماہنامہ طلوع اسلام کے
پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۱ء	مئی تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزم ہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ کراچی

خوش آمدید

(صفحہ ۶ سے آگے)

مخلصین کے ساتھ وہاں کیا کچھ ہوا یہ داستان جگر پاش طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ خود خان بخت جمال خان صاحب کو بھی اپنی عزت اور جان کی حفاظت کے لئے سرحد کو چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ وہ گذشتہ سات آٹھ سال سے قریب قریب جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان حالات میں ہم متردد تھے کہ انھیں کس منہ سے کہیں کہ وہ خدا کے لئے اٹھیں اور ملک کو اس خطرے سے ایک مرتبہ پھر بچا لیں۔ لیکن خلوص اور دیانت کے تو انداز ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ جب "صدر صاحب" نے اس خطرے کا احساس کیا تو اپنے سینے کے تمام زخموں کو بھول گئے اور شمشیر جوہر دار کی طرح تڑپ کر نیام سے باہر آگئے اور ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی جب پشاور میں ان کی پریس کانفرنس کی روئداد ہمارے سامنے آئی۔ زندہ باد خان جمال خان مملکت کے مفاد کی خاطر ذاتی رنجشوں کو اس طرح بھلا دینے کے لئے بہت بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ان کا یہ مخلصانہ اقدام بے حد قابل قدر ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ان کے ایک بیان ہی سے اہل سرحد کے دلوں میں زندگی اور امید کی ایک تازہ لہر دوڑ گئی ہوگی۔ لیکن ہم اربابِ حکومت سے گذارش کرینگے کہ صدر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے گذشتہ آٹھ سال میں "اپنوں" کے ہاتھوں سے جو زخم کھائے ہیں ان کا اندمال نہایت ضروری ہے۔ یہ لوگ وہاں کی بے بہا متاع ہیں جن کی حفاظت خود پاکستان کی حفاظت ہے۔ (جیسا کہ ہم نے گذشتہ اشاعت میں لکھا تھا) ان لوگوں کو نہ دولت کی ہوس ہے نہ اقتدار کی حرص۔ بخت جمال خاں تو وہ مردِ درویش ہے جس نے ساری عمر اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روٹی کھائی ہے۔ اسے نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلہ کی امید۔ لیکن ان کے مقصد کی کامیابی کے لئے یہ تو ضروری ہے کہ ان کے راستے میں جو رکاوٹیں پیدا کر دی گئی تھیں انہیں ہٹا دیا جائے۔

طلوع اسلام محترم صدر صاحب کے اس ولولۂ تازہ پران کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ

چوں تو از دودۂ آذر نفساں می خیزد

اقبال اور قرآن

از پرویز

قیمت ۳ روپیہ صفحات ۲۵۶

سلیم کے نام

از:۔ پرویز

قیمت

چھ روپے

طلوع اسلام کثیر تعداد میں شائع ہو کر پاکستان و ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقہ کے لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گذرتے ہیں۔

نرخنامہ اشتہارات، و تفصیلات ناظم ادارہ (شعبۂ اشتہارات) سے حاصل کیجئے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۳۱۳ کراچی

دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب

"نظامِ ربوبیت"

از:۔ پرویز

ضخامت تین سو صفحات

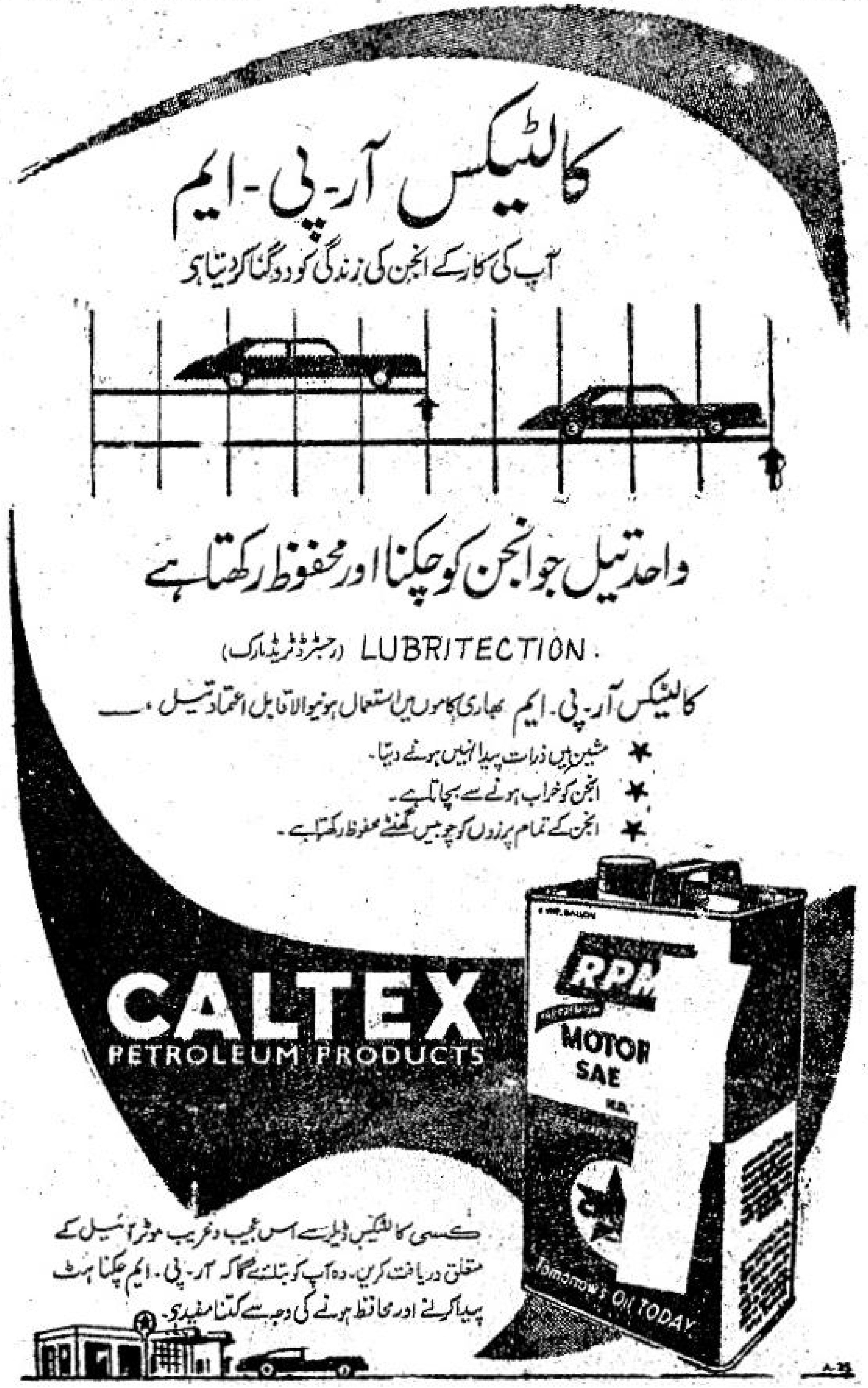

تاریخ الامت

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے ہندوستان کی بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔

اب مولف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔

قیمت پہلا حصہ (سیرت رسول اللہ صلعم) دو روپے
قیمت حصہ دوم (خلافت راشدہ) دو روپے آٹھ آنے
کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائیں گے۔

اسلامیؔ نظام

قیمت ./.۲ روپے

جشن آزادی

کی سالانہ تقریبوں پر طلوع اسلام نے جو مقالے ہر سال لکھے انہیں

جشن نامے

کے نام سے یک جا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان کی آزاد زندگی پر قرآنی نقطہ نگاہ سے بے لاگ تبصرہ ہے۔

اس میں ایسے عنوانات بھی ہیں جو بظاہر مسکراہٹوں کا انداز لئے ہوئے ہیں در حقیقت خندہ زخم جگر ہیں۔ صفات ۲۵۶ قیمت -/۸/۲ روپے

قرآنی دستور پاکستان

اب جبکہ پاکستان کا دستور مرتب کرنے کے لئے جدید مجلس دستور ساز مصروف ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن کے مطابق کس قسم کا دستور مرتب کیا جاسکتا ہے۔ نیز اب تک جو کوششیں کی گئی ہیں وہ کس طرح قرآن کے تصور کے خلاف تھیں۔

اسلامی آئین پر جامع کتاب۔

صفحات ۲۲۲ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

قرآن کی رو سے

تربیت نفس صرف اس معاشرے میں ہوسکتی ہے جس میں
تمام افراد ربوبیت عامہ کے لئے مصروف جدوجہد رہیں۔

اس کے نزدیک اعمال حسنہ

کے زندہ نتائج اسی دنیا کی خوش حالیوں اور خوش گواریوں
کی شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ جن

اعمال کا نتیجہ

اس دنیا کی کامرانی نہیں وہ اعمال قیامت میں بھی کوئی وزن نہیں رکھتے۔

لہذہ

تربیت نفس

ساپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ

ہماری دنیا کس قدر حسین بن چکی ہے۔
کیا ہماری دنیا واقعی حسین بن سکتی ہے؟

اس کے لئے ملاحظہ کیجئے۔

☆ نظام ربوبیت ☆

(از۔ پرویز)

دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔

قسم اول: کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش ۔ چھہ روپے
قسم دوم: کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ ۔ چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱۳ ۔ کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi.
Editor: KHURSHID ALAM

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام

کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۲۹	کراچی: ہفتہ - ۲۰ - اگست ۱۹۵۵ء	قیمت چھ آنہ سالانہ پندرہ روپے

قرآن نے کہا تھا؟

۶ اگست کی اشاعت میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ نظام جس میں ہر شخص اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی کا ذمہ دار خود آپ ہے، کسی دوسرے کو اس سے کوئی سروکار نہیں، غلط ہے۔ صحیح نظام وہ ہے جس میں ہر "چلنے والے" کے رزق کی ذمہ داری "اللہ" پر ہو۔ اسی حقیقت کو اور واضح الفاظ میں یوں بیان کیا کہ۔ ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم (۶/۱۵۲)۔ تم اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ تمہارے اور ان کے رزق کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ اسی ذمہ داری کو سورۂ اسرائیل میں یہ کہہ کر دہرایا ہے کہ۔ نحن نرزقھم وایاکم (۱۷/۳۱) تمہاری اولاد کے اور خود تمہارے رزق کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ یعنی ساری دنیا کے نظام کے خلاف، قرآن نے یہ بتایا کہ ہر انسان اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا۔ اس شخص کی اپنی ذمہ داری نہیں بلکہ "اللہ" کی ذمہ داری ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں آدمی بھوک سے مرجاتے ہیں۔ کروڑوں انسان ایسے ہیں جو خود اور ان کی اولاد ضروریات زندگی سے محروم رہ جاتی ہے۔ جب واقعہ یہ ہے تو پھر "خدا کی ذمہ داری" سے مفہوم کیا ہے؟ (جواب آئندہ قسطوں میں ملاحظہ)۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱ [illegible]

۲ [illegible]

۳ [illegible]

۴ [illegible]

۵ [illegible]

۶ [illegible]

۷ [illegible]

۸ [illegible] ... قرآنی نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

[illegible]

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ قومی زبان کا مسئلہ ★ چودھری محمد علی صاحب ★ یوم آزادی کا تحفہ ★ صوبائی عصبیت کی لعنت ★ [illegible]
★ خودکشی اور اسلامی دستور ★ عورت کا قرآن ★ تاریخی شواہد ★ گذرگشت [illegible] ★ مجلس اقبال
★ مسند امام احمد بن حنبل ★ باب المراسلات ★ حقائق و عبر ★ نقد و نظر ★ عالم اسلامی ★ بین الاقوامی جائزہ

As. -/6/-

تاریخ الامت

علامہ اسلم جیراجپوری مد ظلہ کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے ہندوستان کی بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔

اب مولف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔

قیمت پہلا حصہ (سیرت رسول اللہ صلعم) دو روپے
قیمت حصہ دوم (خلافت راشدہ) دو روپے آٹھ آنے
کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائیں گے۔

اسلامی نظام

قیمت -/-/۲ روپے

جشن آزادی

کی سالانہ تقریبوں پر طلوع اسلام نے جو محاسبے ہر سال لکھے ہیں انہیں۔

جشن نامے

کے نام سے یک جا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان کی آزاد زندگی پر قرآنی نقطہ نگاہ سے بے لاگ تبصرہ ہے۔

اس میں ایسے عنوانات بھی ہیں جو بظاہر مسکراہٹوں کا انداز لئے ہوئے ہیں لیکن در حقیقت خندہ زخم جگر ہیں۔ صفات ۲۵۶ قیمت -/۸/۲ روپے

قرآنی دستور پاکستان

اب جبکہ پاکستان کا دستور مرتب کرنے کے لئے جدید مجلس دستور ساز مصروف ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن کے مطابق کس قسم کا دستور مرتب کیا جاسکتا ہے۔ نیز اب تک جو کوششیں کی گئی ہیں وہ کس طرح قرآن کے تصور کے خلاف تھیں۔

اسلامی آئین پر جامع کتاب۔

صفحات ۲۲۴ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

اسباب زوال امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
ہفتہ وار
طلوعِ اسلام
جلد ۸ | ہفتہ ۲۰ اگست ۱۹۵۵ء | نمبر ۲۹

قومی زبان کا مسئلہ

کہنے کو تو جدید مجلس دستور ساز کا اجلاس جولائی کے اوائل میں شروع ہو گیا تھا۔ لیکن دو ایک روز کی نشستند و گفتند کے بعد اس بناء پر ملتوی کر دیا گیا کہ مری کی آب و ہوا اراکین کو راس نہیں آئی۔ اس کے بعد دوسرا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا مگر وہ مشرقی پاکستان کے سیلاب کی وجہ سے ملتوی ہو گیا۔ دو تین مہینوں کے اندر آئین مرتب و مکمل کرنے کے دعوے باندھنے والوں کی دو ماہ کی کارگزاری دیکھ کر ان سے یہ توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں کہ مستقبل قریب میں سنجیدگی سے اپنے فرائض منصبی کی سرانجام دہی پر توجہ دے سکیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا تھا اگر اس مجلس کو محض مجلس آئین ساز بنے دیا جاتا تو یہ آئین سازی کا اچھا برا کام بہر نوع کر لیتی لیکن اسے جو مقننہ بھی بنا دیا گیا تو اس کی تمام توجہات سیاسی جوڑ توڑ میں صرف ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ بہرحال اس کی تشکیل میں منجملہ دیگر مسائل کے قومی زبان کا مسئلہ پھر سے ابھر کر سامنے آ گیا ہے اور سنجیدہ طبقوں کے لئے وجہ پریشانی بن گیا ہے یہ پریشانی بالکل قابل فہم ہے کیونکہ نہ محض مستوید آئین کے سلسلہ میں اس مسئلہ کو نمٹانا ہو گا بلکہ یہ وزارتی شکست و ریخت کا بھی جو بہر نوع ایک ہنگامی صورت ہے اساس بن گیا ہے گو اس سے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن بنگالی پارٹیوں کی طرف سے بصراحت و تکرار کہا گیا ہے کہ حکومت سے ان کا تعاون اس شرط سے مشروط ہو گا کہ بنگلہ کو بھی اردو کے ساتھ پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جائے۔ اگر یہ مبنی بر حقیقت ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہو گا کہ زبان سے متعلق اندر اندر کچھ سمجھوتہ کر لیا گیا ہے۔ اور اگر سمجھوتہ ہو گیا ہے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ کیا ہے۔

ایسا سمجھوتہ ہوا یا نہیں، یہ مسئلہ بہرکیف مجلس دستور ساز کے سامنے تصفیہ کے لئے آئے گا۔ بشرطیکہ اس جماعت کو کبھی امور ملکی کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت مل گئی۔ لہٰذا بطور حفظ ماتقدم ہم آج کی فرصت میں اس مسئلہ کو اس کے مناسب پس منظر میں پیش کرتے ہیں، اس مخلصانہ امید کے ساتھ کہ شاید ارکان مجلس دستور ساز کے دل میں یہ بات اتر جائے اور انہیں سیاسی سودا بازی سے بالاتر ہو کر لسانی مسئلہ کو طے کرنے کی توفیق نصیب ہو جائے۔

لسانی مسئلہ کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کے لئے ہمیں تقسیم سے کچھ پہلے کی سیاست پر بھی نگاہ ڈالنی ہو گی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اس برصغیر میں انگریز سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے جو سیاسی جدوجہد شروع ہوئی، رفتہ رفتہ اس کا محور یہ تصور ہوتا گیا کہ اس میں بسنے والی متفرق و متعدد قومیتیں واحد قوم میں متحدہ ہندوستانی قومیت کا یہ تصور قریب قریب مسلّم ہو چکا تھا کہ اقبال نے مسلمانوں کے ہندوؤں سے علیحدہ قوم ہونے کی بنا پر جداگانہ علاقہ کا مطالبہ پیش کیا۔ اس دو قومی نظریے کا پیش ہونا تھا کہ ہندوؤں نے متحدہ قومیت کے لئے جارحانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کی رو سے کانگریس نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں جو حکومتیں قائم کیں۔ ان میں انہوں نے سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے سرتوڑ کوششیں کیں کہ مسلمانوں کو وہ "ہندوستانی" بنا لیں تاکہ ان کے مطالبہ علیحدگی کی اساس ہی ختم ہو جائے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے خصوصیت سے اردو کی بجائے ہندی زبان کو ہندوستانی کہہ کے رائج کرنا چاہا۔ حکیم الامت کے نفس گرم نے مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسی بجلیاں بھر دی تھیں کہ انہوں نے اس خس و خاشاک باطل کو جلا کر رکھ دیا اور مطالبہ پاکستان پر پہاڑ کی طرح اٹل کھڑے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان مسلمانوں کے مطالبہ آزادی و علیحدگی کی علامت بن گئی۔ چنانچہ پاکستان اور اردو لازم و ملزوم بلکہ ہم معنی ہو گئے۔ ہندوستان کے ہر صوبے کے مسلمان عام اس سے کہ ان کی مادری زبان کیا تھی اور وہ اردو کو سمجھتے بھی تھے یا نہیں، یہی کہا کرتے تھے کہ اردو ان کی ملّی زبان ہے اور اس کی ترویج کو وہ اپنی مادری زبانوں پر بھی ترجیح دیں گے۔ آج کوئی ایک بھی قابل ذکر پاکستانی مسلمان لیڈر ایسا نہیں ملے گا جس نے تقسیم سے پیشتر اردو کو اپنی قومی اور مادری زبان نہ کہا ہو اور اس کے تحفظ کو اسلام کے تحفظ کے ہم پلہ سمجھا ہو۔ مسلمانوں کی اردو سے اس شدت سے وابستگی کا نتیجہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوؤں کو یہ کہہ کر اردو کے خلاف اکسایا کہ اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

اس طرح جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو یہ ہندو اور مسلمان دونوں کے نزدیک مسلّم تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۴۸ء کے شروع میں قائداعظم نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا تو آپ نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو شخص اردو کے خلاف بات کرتا ہے وہ پاکستان کا غدار ہے۔ اس پر سب نے صاد کیا اور کوئی ایک آواز بھی اس کے خلاف نہ اٹھی۔ لیکن سیاست کے رنگ نرالے ہیں۔ اس کا مدار اصول پرستی پر نہیں مفاد پرستی پر ہے۔ بدقسمتی سے اسلام کے نام لیواؤں نے اسلام کے نام پر وطن بن چکنے کے بعد اسی کمیاؤلی سیاست کو قبول کیا۔ بس پھر کیا تھا۔ تمام مسلمہ اقدار ختم ہو گئیں۔ کجا یہ حالت کہ تقسیم سے پیشتر دس کروڑ مسلمان متفقہ طور پر یہ دعویٰ باندھتے تھے کہ وہ ایک قوم ہیں اور اس بنا پر جداگانہ وطن کا مطالبہ کرتے تھے اور کجا یہ صورت کہ وطن میسر آ جانے پر وہ ان صوبائی وحدتوں میں بٹ کر آپس میں دست و گریبان ہو گئے جو انگریز نے انتظامی امور کی سہولت کی خاطر قائم کی تھیں۔ یہ مصنوعی حد بندیاں اسلام کی عالمگیر صداقتوں کے سامنے سدِ سکندری بن کر حائل ہو گئیں اور پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ کے نعروں سے دنیا بھر کو مرعوب کرنے والے بنگالی، پٹھان، سندھی، پنجابی، بلوچی جانے کیا کیا کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ جب وحدت ملت کا تصور ذہنوں سے محو ہوا تو جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں اس صوبائی تعصب کے ہاتھوں پاکستان میں "مینار بابل" تعمیر ہوا جسے سابقہ مجلس دستور ساز نے قومی درجہ دے دیا۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ اس مجلس نے جو نام نہاد لسانی فارمولا تیار کیا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ پاکستان کی قومی زبانیں اردو اور بنگلہ ہوں گی۔ البتہ بیس سال تک سرکاری زبان انگریزی رہے گی نیز اگر کوئی صوبائی اسمبلی مطالبہ کرے تو اس کی صوبائی زبان بھی قومی دی جا سکے گی۔ اس کے ساتھ حکومت پر یہ ذمہ داری عاید کی گئی تھی کہ وہ ایک مشترکہ زبان تیار کرنے کی کوشش کرے۔ ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

ایک سے زیادہ قومی زبانوں کا مطالبہ کرنے والے اپنی تائید میں ان ممالک کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں متعدد زبانوں کو قومی درجہ حاصل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کینیڈا، سوئٹزرلینڈ جیسے ممالک موجود ہیں جہاں ایک سے زیادہ زبانوں کو قومی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ارباب سیاست یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ زبان خواہ ایک ہو خواہ زیادہ وہ ملک پر اوپر سے مسلط نہیں کی جاتیں بلکہ اندر سے ابھرتی ہیں کسی زبان کو کسی ملک میں قومی قرار دینا قانون کا کام نہیں بلکہ ایک مسلسل اور تدریجی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قانون اس عمل بے پناہ کا فقط اعتراف کرتا ہے

اور بس۔ یعنی عموماً یہ ہوتا ہے کہ قانونی درجہ اختیار کرنے سے پہلے زبانیں عملاً اس مقام کو حاصل کر چکی ہوتی ہیں۔

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو پاکستان کی قومی زبان کا معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ پاکستان ایک تحریک کا نتیجہ ہے۔ اور اس تحریک کا مطالبہ اردو کا تھا لہٰذا اب کسی اور زبان کو اردو کے ساتھ یا اردو کے علاوہ، قومی درجہ دیدیا جائے تو یہ اس تحریک سے غداری ہوگی۔ یقیناً کسی لیڈر کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ آج وہ تحریک کے اساسی تقاضے کے خلاف جائے۔ جو ایسا کرے گا اسے بجا طور پر تحریک کا غدار کہا جائے گا۔ تعجب ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کو علاقائی خود مختاری کے حق میں صحیفۂ آسمانی سمجھ کر پیش کرنے والے اس بنیادی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اسی قرارداد کی رُو سے ملک میں جو تحریک چلائی گئی تھی اس میں اردو کو کیا مقام حاصل تھا۔ اس ناقابل تردید حقیقت کی بنا پر یہ حتم و یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی قومی زبان کا مسئلہ پاکستان کی پیدائش سے پہلے طے ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس پر مزید بحث و تمحیص لاحاصل ہے۔ لیکن اگر بغرض استدلال اسے تسلیم نہ کیا جائے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جو زبانیں پاکستان میں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے کس کو یا کس کس کو قومی درجے کا حق حاصل ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے بنگلہ کو دیکھئے۔ وہ سراسر علاقائی زبان ہے۔ وہ ایک ہی حصہ میں بولی جاتی ہے۔ اور دوسرے حصے میں اس کا کوئی سمجھنے والا نہیں ملے گا۔ اسی طرح مغربی پاکستان کی زبانیں بھی زیادہ سے زیادہ اپنے اپنے صوبوں تک محدود ہیں لہٰذا ان میں سے بھی کوئی ایک زبان بھی قومی قرار نہیں دی جا سکتی۔ یہ کہنا کہ بنگلہ کے بولنے والے کثیر تعداد میں ہیں قابل قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک تو بنگلہ کے بولنے والے دوسرے حصہ ملک سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہیں۔ دوسرے زبان کا تعین مزاج قومی کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ کثرت آراء پر۔ اگر فیصلہ کا مدار رائے شماری پر ہو گیا تو ہمیں اس کے لئے تیار رہنا ہوگا کہ آبادی کی کمی بیشی کے مطابق آئندہ زبانیں بدلتی رہیں۔ بنگلہ کے حامی یقیناً اس صورت حال کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ حالانکہ ان کے استدلال کا یہ منطقی نتیجہ ہے ان حالات میں پاکستان کی کوئی ایک علاقائی زبان بھی قومی درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ اگر یہ صورت تسلیم کر لی جائے تو ہمارے پیش نظر اردو اور انگریزی دو زبانیں رہ جاتی ہیں۔ ان میں سے اردو کی یہ پوزیشن ہے کہ وہ عربی کے بعد مسلمانوں کی مذہبی زبان کہی جا سکتی ہے۔ مذہبی اس اعتبار سے کہ اس میں مسلمانوں کا اتنا لٹریچر ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی کسی اور زبان میں نہیں ملے گا۔ ایسی زبان کو خیرباد کہنا اپنی قومی علمی میراث سے محروم ہونا ہے یقیناً کوئی باشعور قوم ایسی قربانی نہیں کرے گی۔ دوسری زبان یعنی انگریزی ہماری سرکاری زبان ہے۔ اور بحالات موجودہ اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اسے ایک عرصہ کے لئے ہمیں سرکاری زبان رکھنا ہوگا۔ لیکن اسے قومی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ گویا اس طرح بھی محض اردو ہی ہمارے پاس وہ زبان رہ جاتی ہے جسے قومی کہا جا سکے۔

الغرض کسی حیثیت سے دیکھا جائے، اردو سے مفر نہیں لیکن چلئے ہم ان تمام ملحوظات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور فرض کئے لیتے ہیں کہ پاکستان کسی تحریک کا نتیجہ نہیں، بلکہ آج ایک دم اسی ناگفتہ بہ حالت میں معرض وجود میں آگیا جس تک ہماری شامت اعمال نے اسے پہنچایا ہے گویا اس نے آنکھ کھولی تو زبانوں کا ایک دن پڑا ہوا تھا اور کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا لہٰذا سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ اس کا جواب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا ہوگا آپ جب ایک سے زیادہ قومی زبان پر زور دیتے ہیں تو آپ کے دل میں یہ ڈر ہوتا ہے کہ تنہا دوسری زبان کو قومی بنا دیا گیا تو آپ اس زبان کے بولنے والوں سے پیچھے رہ جائیں گے یا یہ کہ وہ آپ پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ اگر فی الواقعہ یہ خدشہ موجود ہے تو اس کا یقیناً تدارک ہونا چاہیئے لیکن تدارک کرنے سے پہلے ذرا یہ سوچ لیجئے کہ آپ کس گروہ کے متعلق بات کر رہے ہیں کہ وہ آپ پر غالب آجائے گا۔ کیا یہ وہی لوگ نہیں جنہیں آپ اسلام کی بناء پر اپنا بھائی کہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کیا آپ کو یہ ڈر ہے کہ آپ کا بھائی آپ پر غلبہ پالے گا! ذرا دل کو ٹٹولئے اور اپنے آپ سے پوچھئے کہ اگر آپ کے بھائی کو حکومت و اقتدار میسر آجائے تو وہ آپ سے کیا سلوک کریگا؟ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں اپنے فائدے کے لئے اور آپ کے نقصان کے لئے استعمال کرے گا۔ تو پھر یقین کر لیجئے کہ وہ آپ کا بھائی نہیں بلکہ دشمن ہے۔ آپ اس دشمن سے اولین فرصت میں الگ ہو جایئے۔ کیونکہ جب تک وہ آپ کا دشمن ہے وہ آپ کی زبان ہوتے ہوئے بھی آپ کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کا بھائی ہے اور آپ کو بہرصورت اس کے ساتھ اسی ایک گھر میں رہنا ہے تو پھر آپ ڈر کس بات سے رہے ہیں؟ یہ تنا اہم ہے کہ آپ اس بھائی کے ساتھ مل کر اسی ایک مکان میں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ نے گزشتہ سال لسانی فارمولا تیار کر کے لسانی فوضویت (ANARCHY) کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ ایک زبان کی تشکیل کے لئے کوشاں رہے۔

اگر یہ مسلمہ صحیح ہے تو بات یوں ہوگی کہ آپ پاکستان کو ایک ملک سمجھتے ہیں اور اس میں بسنے والوں کو ایک قوم اور آپ دل سے چاہتے ہیں کہ اس ملک اور اس قوم کی زبان ایک ہو۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی زبان ایسی نہیں جو تمام باشندوں کی مجموعی زبان قرار دی جا سکے۔ لہٰذا آپ از راہ احتیاط یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ دو بڑی زبانوں کو بیک وقت قومی تسلیم کر لیا جائے۔ اگر بات یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے نزدیک اردو اور بنگلہ (اور دیگر صوبائی زبانیں) ابھی اس قابل نہیں کہ تنہا طور پر قومی زبان قرار دی جا سکیں اب آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں یہی انسب ہے کہ ہم دو بڑی زبانوں کو لے لیں اور قومی زبان قرار دے دیں؟ کیا اس سے زیادہ بہتر یہ نہیں ہوگا کہ ملک اور قوم کو ذرا اور مہلت دے دیں کہ وہ ایک قومی زبان ڈھال لیں! اس کے لئے مدت بھی معین کی جا سکتی ہے۔ یعنی یوں کیا جا سکتا ہے کہ ہم کہہ دیں کہ آئندہ دس یا پندرہ یا بیس سال تک ہم کسی زبان کو قومی قرار نہ دیں اور اس مدت کے بعد دیکھیں کہ کونسی زبان ترقی کر کے اپنے آپ کو قومی بنائے جانے کا مستحق بنا لیتی ہے۔ ایسا کر دیا جائے تو اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس معاملہ میں ایک دوسرے سے لڑیں گے نہیں اور جو قوت اس وقت باہمی لڑائی میں صرف ہو رہی ہے۔ وہ تعاون میں بدل جائے گی۔ اور ہماری تعمیر کی ضامن ہو جائیگی اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ کوئی زبان آئندہ نسلوں پر مسلط کرنے کے مجرم نہیں ہوں گے۔ بلکہ ہم ان کو آزاد چھوڑیں گے کہ وہ اپنے وقت کے حالات کے مطابق مناسب فیصلہ کریں اس صورت میں ہمیں عبوری دور کے لئے انتظام کرنا ہوگا اور یہ چنداں دشوار نہیں ہونا چاہیئے۔ سیاسی طور پر ہم ملک کے دو یونٹ بنا رہے ہیں۔ ان دو یونٹوں کے اندر زبان سے متعلق عمومی اتفاق پایا جاتا ہے۔ یعنی مشرقی پاکستان والے بنگلہ چاہتے ہیں اور مغربی پاکستان والے اردو۔ لہٰذا مشرق کی زبان بنگلہ اور مغرب کی اردو۔ اور یہ دونوں حصے باہمی معاملات کے لئے انگریزی استعمال کریں۔ انگریزی ہماری سرکاری زبان ہے اور ابھی برسوں اسے سرکاری زبان رہنا ہوگا لہٰذا اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات غور طلب ہے اور وہ یہ کہ جب ہم پاکستان کو ایک ملک سمجھتے ہیں اور اس میں بسنے والوں کو ایک قوم، اور اس کے لئے ایک ہی زبان رائج کرنے کے متمنی ہیں تو ہمیں ابتدا ہی سے تمام علاقائی زبانوں کا رسم الخط ایک کر دینا ہوگا۔ مسلمانوں کے ہاں یہ رسم الخط سوائے عربی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایک رسم الخط سے نہ محض یکسانیت پیدا ہوگی بلکہ اس سے ایک زبان کی تشکیل بھی آسان ہو جائے گی۔

ہمیں توقع ہے کہ اراکین مجلس دستور ساز سیاسی جوڑ توڑ کی گرما گرمی سے الگ ہٹ کر ہماری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور اگر انہیں ملک و ملت کے لئے مفید پائیں گے تو ان پر عمل کرنے سے گریز نہیں کریں گے ہم قارئین سے بھی گذارش کرتے ہیں کہ اگر وہ اس تجویز سے اتفاق کرتے ہیں تو اراکین مجلس کو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کریں یعنی ان سے کہیں کہ وہ آئینی طور پر یہ متعین کر دیں کہ پاکستان میں دو زبانیں (اردو اور بنگلہ) قومی زبانیں ہوں گی۔ اس سوال کو سردست غیر متعین رہنے دیں اور عملی کاروبار کے لئے مشرقی پاکستان میں بنگلہ اور مغربی پاکستان میں اردو کو۔ اور باہمی معاملات کے لئے انگریزی کو رائج رہنے دیا جائے۔ اگر ہمارے مجوزہ آئین کی رُو سے دونوں یونٹ زیادہ سے زیادہ حد تک خود مختار قرار پا گئے اور مرکز میں کم از کم معاملات رہ گئے تو پھر مندرجہ بالا تجویز خود بخود استمرار حاصل کرے گی۔

چودہری محمد علی صاحب

۱۴ر اگست کا طلوع اسلام جب پریس میں جا رہا تھا تو اسوقت مرکزی وزارت کی تشکیل کا مسئلہ ہنوز اپنے آب و گِل میں تھا لیکن قرآئن سے مترشح ہوتا تھا کہ مسلم لیگ اور عوامی لیگ کا باہمی تعاون ہو جائیگا اور اس طرح مرکز میں ان دونوں کی مخلوط وزارت بن جائے گی۔ ہمارے لئے سب پارٹیاں یکساں ہیں ---- سگ زرد برادر شغال ---- لیکن مسلم لیگ اور عوامی لیگ کی مخلوط وزارت سے ہم نے اس اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ اس سے مرکز اس متحدہ محاذ کے تسلط سے آزاد رہیگا جو ہندو مفاد پرستوں کا ضامن ہے۔ لیکن یہاں کی بساطِ سیاست کے نقشوں کے متعلق تو قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ---- بعینہٖ جس طرح کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولوی فضل الحق کل کیا ارشاد فرما دیں گے ---- چنانچہ ہوا یہ کہ مسلم لیگ اور متحدہ محاذ کا تعاون ہو گیا اور عوامی لیگ حزب مخالف میں چلی گئی۔ اس سے کم از کم ان لوگوں کے خیال کی تائید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ اسوقت پاکستان میں کوئی شخص ایسا نہیں جو فضل الحق صاحب کی سیاست کا حریف ہو سکے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مولوی صاحب کے سامنے اپنے دو حریف اور ایک منتہیٰ تھا۔ یعنی مسٹر محمد علی اور مسٹر سہروردی دو حریف؛ اور منتہیٰ یہ کہ وہ خود وزیر اعظم بن جائیں۔ اپنے دونوں حریفوں کو تو انھوں نے لے لیا۔ (قارئین ۲۵ر جون کا طلوع اسلام ملاحظہ کریں جس میں ہم نے لکھا تھا کہ جو محمد علی آج فضل الحق سے اسقدر محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہے کچھ تعجب نہیں کہ یہ اسی کے ہاتھوں ایوان حکومت سے باہر نکالا جائے) اب اس کے بعد اپنے منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے ان کا راستہ صاف ہے۔ وہ عوامی لیگ کے اراکین سے کہیں گے کہ تم نے سہروردی کے پیچھے لگ کر کیا لے لیا؟ نہ صوبے کی وزارت میں تمہارا کوئی حصہ ہے نہ مرکزی وزارت میں۔ میری طرف آؤ اور دونوں میں حصے پاؤ۔ بنگال ہموار ہو گیا تو انھیں مغربی پاکستان سے صرف چند آرا کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے وہ یہاں کے محرومین کے ٹولے میں سے پانچ چار کو وزارت پیش کر کے بآسانی اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ ایسا ہو گیا تو ہمیں بڑا رنج ہوگا کہ ملک چودہری صاحب جیسے کارکن کی خدمات سے محروم ہو جائے گا۔ چودہری صاحب کی کم از کم دو خصوصیات ایسی ہیں جن میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے خلاف ان کا مخالف بھی رشوت ستانی (CORRUPTION) کا الزام نہیں لگا سکتا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ بے حد محنتی ہیں۔ خدا کرے کہ مولوی صاحب کی سیاست کے متعلق لوگوں کے عام اندازے غلط نکلیں اور ملک چودہری صاحب کی خدمات سے محروم نہ ہونے پائے۔

لیکن اس سے بھی بڑھکر ایک اور خطرہ ہے جس سے ہم محترم چودہری صاحب کو قبل از وقت آگاہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ گذشتہ آٹھ سال میں پاکستان کو جو سب سے زیادہ خطرناک دھکا لگا ہے وہ خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارت کے دوران کا واقعہ ہے۔ خواجہ صاحب طبعاً مذہب پرست واقع ہوئے ہیں اس لئے ان کا میلان "علماء" کی طرف زیادہ تھا اور ان کے اسی میلان کا نتیجہ تھا کہ مجلس آئین ساز میں آئین کی ناؤ گرداب میں چکر لگاتی رہی اور ساحل مقصود کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھ سکی۔ اور اسی میلان کا نتیجہ تھا کہ ملک کو ۱۹۵۳ء میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنی پڑی جس سے قوم پر وہ تباہی آئی جس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔

چودہری صاحب کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ ان کی ہمدردیاں جماعت اسلامی کے ساتھ ہیں۔ بلکہ بعض لوگ انھیں اس جماعت کے السابقون الاولون میں شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم اُس احترام کے ساتھ جو چودہری صاحب کے لئے ہمارے دل میں موجود ہے، چودہری صاحب کی خدمت میں بادب گذارش کریں گے کہ وہ اس کی خاص احتیاط برتیں کہ ان کے یہ میلانات ملک کی سیاست پر اثر انداز نہ ہونے پائیں بالخصوص جب کہ متحدہ محاذ میں نظام اسلام پارٹی بھی شامل ہے جس کا اسلامی جماعت کے ساتھ پورا پورا تعاون ہے۔ جماعت اسلامی اس شوریدہ بخت قوم کو جن تباہیوں کی طرف لئے جا رہی وہ ارباب بصیرت کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ---- اور ملک اس وقت جس نازک دوراہے پر کھڑا ہے، وہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے ---- ایسے نازک وقت میں اس قسم کی تخریبی جماعت کا جو لوگوں کے جذبات سے اس بری طرح کھیل رہی ہے ذرا سا جرأت مندانہ اقدام ملک کو تباہیوں کے جہنم میں دھکیل دینے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ یہ حقیقت چودہری صاحب جیسے بالغ نظر کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی۔

ان توقعات کے ساتھ ہماری آرزو ہے کہ محترم چودہری صاحب اپنوں اور بیگانوں کے تمام خطرات سے محفوظ رہتے ہوئے اپنی محنت اور دیانت سے اس ملک کی بگڑی ہوئی تقدیر کو سنوارنے میں کامیاب ہو جائیں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

یوم آزادی کا تحفہ

انیسویں صدی نے دنیا کو جو تباہ کن لعنتیں عطا کیں ان میں سب سے زیادہ ہلاکت انگیز اور انسانیت کش نیشنلزم (وطنیت) کا تصور تھا۔ اس نظریہ کی تفاصیل تو طول طویل ہیں لیکن اس کے ماحصل کو انگریزی زبان کے ان چار الفاظ میں سمیٹ دیا گیا ہے جو وطنیت پرست اقوام کے یہاں "کلمہ" کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی (MY COUNTRY - RIGHT OR WRONG) اس کا مطلب یہ ہے کہ میری حمایت بہرحال میرے ملک کو حاصل رہے گی۔ خواہ وہ حق پر ہو خواہ باطل پر۔ قومیت پرستی کے اس تصور نے دنیا کو جس جہنم میں دھکیل دیا ہے اس کا اعتراف خود یورپ کی اقوام کو اس شدت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ وہ اب اس "کلمۂ خبیثہ" سے توبہ کی راہیں تلاش کر رہی ہیں اور اس طرح وہ عملاً اس حقیقت کبریٰ کی معترف ہو رہی ہیں کہ اسلام نے اس تصور کو جو انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا تھا تو وہ کسقدر برحق تھا!

یورپ میں تو اس نظریے کے خلاف یہ کچھ ہو رہا ہے اور ادھر یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت کے صدرِ اعظم، میجر جنرل اسکندر مرزا صاحب نے اپنی مسند نشینی کے بعد، یوم آزادی کی پہلی تقریب پر اہل مملکت کو جو تحفہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا ماٹو یہ ہوگا کہ

(MY COUNTRY_RIGHT OR WRONG)

نہ ہوا آج اقبالؒ زندہ جو اس تحفۂ گراں قدر پر گورنر جنرل پاکستان کو صحیح صحیح داد دیتا! وہ اقبال جس نے اس انسانیت سوز نظریہ کے متعلق لکھا تھا کہ

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔

اور مسلمان سے تاکید کی تھی کہ

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

وہ زندہ ہوتا تو آج دیکھتا کہ خود اس کے تصور کے پیدا کردہ پاکستان میں، اس بت کو کس طمطراق سے نصب کیا جا رہا ہے جسے یورپ اپنے صنمکدوں سے اس پشیمانی سے باہر نکال رہا ہے۔

مرزا صاحب کے پیغام کے سیاق و سباق پر نگاہ ڈالی جائے تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ملک کا مفاد دیگر تمام مقتضیات و مفادات پر مقدم رہنا چاہئیے (اسے انگریزی میں COUNTRY FIRST کہتے ہیں) لیکن انھوں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ اپنا مفہوم متعین رکھتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقعہ وہی کچھ کہنا چاہتے تھے جس کی طرف ہم نے ادپر اشارہ کیا ہے تو انھیں اپنا مفہوم واضح کرنا چاہئیے ورنہ ان کے موجودہ جملے سے بے حد غلط فہمیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایک مسلمان کا ماٹو، حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت ہے۔ وہ اپنے ملک کی حمایت بھی اسی لئے کرتا ہے کہ وہ حق پرستی کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اگر اس کا ملک باطل کی آماجگاہ ہو رہا ہو تو اس باطل کے استیصال کے لئے انتہائی کوشش کرتا ہے اور اگر وہ کسی وقت محسوس کرے کہ اس کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں تو وہ ایسے ملک پر ہزار لعنت بھیجکر کسی ایسی سرزمین کا رخ کر لیتا ہے جہاں وہ حق پرستی کا بیج بو سکے۔

صوبائی عصبیت لعنت ہے! اسے قائم رکھو!

مولوی فضل الحق صاحب نے، یوم آزادی کی تقریب پر قوم کو پیغام دیتے ہوئے فرمایا کہ

بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایسا رجحان زور پکڑ رہا ہے جس کی رو سے برادران پاکستان میں باہمی تفریق کی کوشش کی جاتی ہے اور اہل پاکستان کو اس بنا پر تقسیم کیا جاتا ہے کہ فلاں کس نسل سے ہے اور فلاں کی سکونت کس علاقہ کی ہے۔ میرے خیال میں پاکستان میں ایسی تفریق کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ فلاں مغربی پاکستان کا ہے اور فلاں مشرقی پاکستان کا۔ میرا یقین محکم ہے کہ اہل پاکستان کو تمام نسلی اور جغرافیائی امتیازات سے بلند ہونا چاہئیے۔

کس قدر بلند اور پاکیزہ تھے یہ ارشادات جن پر ہر طرف سے احسنت کی صدائیں فضا میں گونج اٹھیں۔ لیکن ان صداؤں کا ہنوز ارتعاش ختم نہ ہونے پایا تھا کہ انھوں نے (اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کا موجودہ گورنر جنرل بھی غیر بنگالی ہے اور وزیر اعظم بھی غیر بنگالی) اپنے پیغام کا اختتام ان الفاظ پر فرمایا کہ۔

ہمارا موجودہ گورنر جنرل بنگالی اور صرف بنگالی ہے۔ وہ مرشد آباد کے نظامت (شاہی) خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو مغربی بنگال میں واقع ہے ...... یہ نہ صرف بنگالی ہیں بلکہ ان کی رگوں میں شاہی خون بھی دوڑ رہا ہے۔ اس لئے وہ اس منصب بلند کے لئے جس پر وہ اب فائز ہیں دوہری وجوہات کی بنا پر موزوں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اہلِ بنگال کو اس پر فخر ہے کہ گورنر جنرل انہی میں سے ہیں اور انہی جیسے بنگالی۔

ہاتھ لا استاد! کیوں؟ کیسی کہی؟

ہے کہاں روزِ مکافات؟

کشمیر کا مسئلہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ پاکستان اس کے بغیر نامکمل نہیں نیم جان ہے اور اگر اس کا الحاق نہ ہوا تو پاکستان کی زندگی معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔ لیکن گو زبان و قلم سے قریباً ہر روز یہ دہرایا جاتا ہے کہ کشمیر پاکستان کے لئے موت و حیات کا سوال ہے، اس کی معنویت پر ایمان کا یہ حال ہے کہ مسلسل آٹھ سال سے اس کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جاتا رہا کہ اس کے خاطر خواہ حل کی جملہ امیدیں ایک ایک کر کے ختم ہو گئی ہیں۔ اس دوران میں ماسوا اس کے کہ ہم نے ہندوستان سے استصواب رائے کے بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرائے کوئی ایک پہلو بھی ہماری تسکین کا اس سے نہیں نکلا۔ الٹا ہم نے التوائے جنگ پر اتفاق کر کے ہندوستان کو مہلت دے دی کہ وہ عسکری طور پر پوری طرح کشمیر میں قدم جمائے اور اطمینان سے ریاست کو ہضم کرتا چلا جائے۔ آج کشمیر ہندوستان میں کم و بیش پوری طرح مدغم ہی نہیں ہو چکا بلکہ وہ آبادی کے اعتبار سے ہندو بنتا چلا جا رہا ہے۔ جموں کا صوبہ تو تقسیم کے فوراً بعد ہی مسلمانوں کے قتل عام کے ذریعے غیر مسلم بنا لیا گیا تھا، حالانکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اب باقی علاقوں میں بھی ہندوستان سے غیر مسلم لا لا کر آباد کئے جا رہے ہیں اور انھیں طرح طرح کی مراعات دے کر ریاست کا شہری قرار دیا جا رہا ہے۔ کشمیر کی مسلمان آبادی کو ہندو آبادی میں بدلنے کی تحریک ایسی شدت اختیار کر چکی ہے کہ وہاں کے مقامی باشندے بے پناہ مظالم کے شکار ہوتے ہوئے بھی اس کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ریاست کے اندر استصواب رائے کے فوری انعقاد کا مطالبہ قوت پکڑتا اور تحریک کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ بالکل قابل فہم ہے کیونکہ مظلوم و مقہور باشندگانِ کشمیر غلامانہ زندگی پر تو بامر مجبوری زہر کے گھونٹ پی کر قناعت کر سکتے تھے لیکن اسے وہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کی آبائی سرزمین پر ان کا اور ان کی اولاد کا جینا محال ہو جائے۔ غلامی کی صورت میں وہ آزادی کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن ہندو استعماریت تو ان کے استبداد و استیصال کی تمہید ہے۔

کشمیر میں یہ کچھ ہو رہا ہے اور ہمارے قائدین روم کے سوائی نیرو کی طرح اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہیں۔ آٹھ سال ٹانک ٹوئیے مارنے کے بعد بڑی مشکل سے سابق وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے یکم اگست کو یہ اعلان کیا تھا کہ انھوں نے مجلس دستور ساز کی تمام پارٹیوں کی ایک کانفرنس طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس میں آزاد کشمیر کے مندوبین بھی شریک ہوں گے اور یہ کانفرنس حکومت کو کشمیر کے بارے میں مشورہ دے گی۔ باوجودیکہ کشمیر کے سلسلہ میں ملک میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا، ہم نے اس اعلان کو غنیمت جانا تھا کہ شاید اس مل بیٹھنے سے مطلوبہ حرکت و عمل کی شکل پیدا ہو جائے۔ اس کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ پاکستان کی مرکزی حکومت بدل گئی۔ اس "انقلاب" کے محرکات کو دیکھا جائے اور اس کے نتائج کا جائزہ لیا جائے تو اقبال کے الفاظ میں کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسی قوم کو زیب دے سکتا ہے جو صالح کردار سے بیگانہ ہو اور بساطِ زندگی میں جس کے سب [illegible] کھل گئے ہوں۔ اس کے بعد ہر چند نئی ہیئت حاکمہ نے اعلان کیا کہ پیش نظر مسائل میں سے کشمیر کو اولیت حاصل ہے۔ دوسرے ہی دن یہ خبر آ گئی کہ مجوزہ کشمیر کنونشن جس کا انعقاد اسی ہفتے میں ہونا تھا، ملتوی کر دی گئی ہے کیونکہ مجلس دستور ساز اچانک ملتوی ہو گئی ہے۔

اب ذرا اس التوا کو دیکھئے۔ کہتے ہیں کہ یہ مشرقی پاکستان کے سیلاب کی بدولت ہوا ہے لیکن مجلس دستور ساز کے ۱۲؍ اگست کے اجلاس کی کارروائی پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ یہ مطالبہ عوامی لیگ کی طرف سے ہوا اور ہر چند متحدہ محاذ کے بنگالی اراکین پر بھی سیلاب کا اتنا ہی اثر پڑتا تھا جتنا عوامی لیگ کے ارکان پر لیکن اس کے حق میں صرف آخر الذکر پارٹی کے ارکان بولے۔ کیا بنگال کے دریاؤں نے صرف عوامی لیگ والوں کے مکانوں کو نشانہ بنایا تھا؟ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک دن پہلے مسلم لیگ اور عوامی لیگ میں مخلوط وزارت بنتے بنتے ٹوٹ گئی تھی اور عوامی لیگ کی جگہ متحدہ محاذ نے لے لی تھی، اور اب عوامی لیگ کا کام مجلس کے کام میں رخنے ڈالنا ہو گیا تھا؟ ہم سیلاب کی مصیبت کا استخفاف نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری دلی ہمدردی ان بھائیوں کے ساتھ ہے جو اس آسمانی بلا کا شکار ہیں۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر رہ نہیں سکتے کہ یہاں سیلاب کو بھی سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا۔

التوا کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کی وجہ سے کشمیر کنونشن کا التوا اور پریشان کن اور تشویشناک ہو جاتا ہے۔ یہ حالت اس عزم کے بعد کی ہے کہ کشمیر کو تمام مسائل پر اولیت حاصل ہے۔ اس پر اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ!
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

خودکشی اور اسلامی دستور

۱۰؍ اگست کے نوائے پاکستان میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

نیامزنگ (لاہور) سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہاں ایک شادی شدہ خاتون منور سلطانہ نے مسلسل فاقہ کشی سے تنگ آ کر خودکشی کر لی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ متوفیہ کا خاوند ریلوے میں معمولی تنخواہ پر ملازم ہے۔ متوفیہ عرصہ سے پھیپھڑوں اور چھاتی کی بیماری میں مبتلا تھی۔ متوفیہ کے خاوند نے توفیق سے بڑھ کر متوفیہ کی بیماری پر خرچ کر کے اس کا علاج کرایا۔ کہتے ہیں کہ خاوند نے متوفیہ کو لاہور کے تمام اسپتالوں میں داخل کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ان تمام حالات سے خاوند سخت پریشان رہنے لگا۔ متوفیہ کو خاوند کی پریشانی کا بھی پوری طرح احساس تھا۔ مدد کے طور پر متوفیہ اپنی پھوپی کے گھر گئی اور وہاں سے بھی واپس گھر آ گئی۔ یہاں متوفیہ کو پھر ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ جس کے بعد خاوند ملازمت پر چلا گیا۔ وہاں سے گھر آیا تو متوفیہ زندگی کا خاتمہ کر چکی تھی۔ متوفیہ کا ایک لڑکا پانچ برس کا اور ایک لڑکی دو برس کی ہے۔

اگر پاکستان کا مجوزہ اسلامی دستور معاشرہ کے اس قسم کے جگر خراش اور روح فرسا حالات کا اطمینان بخش علاج اپنے اندر نہیں رکھتا تو سمجھ لیجئے کہ اسے اسلام سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ اسلام کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا واحد اور مکمل حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر وہ انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا اطمینان بخش حل نہیں پیش کر سکتا تو ہمارا یہ دعویٰ کبھی سچا نہیں قرار پا سکتا۔ اسی لئے قرآن نے اس نظام کو پیش کیا ہے جس کی رو سے مملکت میں بسنے والے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے۔

کیا پاکستان کے لئے نیا دستور مرتب کرنے والے اس اہم حقیقت کو اپنے سامنے رکھیں گے؟

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے ۱۳؍ اگست کا تسنیم آیا جو جماعت اسلامی کا ترجمان ہے۔ اس میں مندرجہ صدر واقعہ کے متعلق ایک صاحب کا خط شائع ہوا ہے۔ اس خط میں وہ (اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد) پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی دردناک کہانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اخبارات انھیں نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ بعض معاصرین غریب کی دردناک کہانی کا نام لے کر اس میں اپنے مخصوص مقاصد کے تحت پُر فریب مستقبل اور وعدوں اور امیدوں کا وہ رنگ بھرنا شروع کر دیتے ہیں کہ جب ذرائع دولت اجتماعی قبضہ میں ہوں گے اور ان کو

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

تاریخی شواہد

(۲۷)

وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَھُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ؁ فَعَتَوْا
عَنْ اَمْرِ رَبِّھِمْ فَاَخَذَتْھُمُ الصّٰعِقَةُ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ ؁
فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا کَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ ؁ (۵۱/۴۳-۴۵)

اور (تمہارے لئے اے پیروان دعوت اسلامی) ثمود (کے حالات) میں عبرت ہے۔ جب ان سے کہہ دیا گیا کہ (تمہارے لئے کچھ مدت تک مہلت ہے۔ چنانچہ) وقت معین تک کھا پی لو۔ چنانچہ (وہ اپنے انکار و بدعملی سے باز نہ آئے۔ اور) انھوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی اختیار کی۔ بالآخر انھیں ایک کڑک نے آپکڑا۔ حالت یہ تھی کہ وہ یہ (سب کچھ) دیکھ رہے تھے (مگر کچھ نہ کرسکتے تھے) انھیں کھڑا ہونے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ اور نہ وہ اپنا بچاؤ کرسکتے تھے۔

ہلاکت اور ایسی ہلاکت یا تباہی اور اس قدر تباہی!!

وَعَادًا وَّ ثَمُوْدَ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَیْنَ ذٰلِکَ
کَثِیْرًا ؁ وَکُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَکُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا ؁ (۲۵/۳۸-۳۹)

اور عاد کو اور ثمود کو اور اصحاب الرس کو اور ان کے درمیان میں بہت سی امتوں کو ہم نے تباہ کردیا (امم مذکورہ میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی مؤثر اور بلیغ) مثالیں بیان کیں۔ (مگر انھوں نے ان سے کوئی اثر نہ لیا اور (جب مکافات عمل کا وقت آپہنچا، تو) ہم نے ہر ایک کو بالکل ہی برباد کردیا۔

بھلا قانون مجازات کی گرفت سے کوئی چھوٹ سکتا ہے؟

وَثَمُوْدَا فَمَآ اَبْقٰی ؁ (۵۳/۵۱)

اور (دیکھو تمہارے پروردگار نے) ثمود کو بھی تباہ کردیا۔ چنانچہ اُسے (صفحۂ ہستی پر) باقی نہیں رکھا۔

اور جب جرائم ایسے سنگین ہوں تو ان کی پاداش کی سختی بھی اسی قسم کی ہوگی۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُھْلِکُوْا بِالطَّاغِیَةِ ؁ (۶۹/۵)

چنانچہ ثمود کو دیکھو کہ وہ کس قدر انتہائی دردناک سزا کے ساتھ ہلاک کئے گئے۔

یہ تھا عذاب جو آج بھی ہر سننے والے کے لئے وجہ ہزار عبرت و موعظت ہے۔

فَاَخَذَھُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا کَانَ
اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ؁ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ؁ (۲۶/۱۵۸-۱۵۹)

چنانچہ (دیکھو) انھیں قانون مکافات کے عذاب نے آپکڑا۔ بلاشبہ اس واقعہ میں (نصیحت اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے ایک بڑی) نشانی ہے۔ اور (بات یہ تھی کہ) ان میں سے اکثر (معاندانہ انکار و بدعملی کی وجہ سے قبول حق کی صلاحیت کو کھوچکے تھے اور) ایمان لانے والے نہیں تھے (چنانچہ رحمت خداوندی کا یہی تقاضا ہوا کہ ان کو ہلاک کردیا جائے۔ کیونکہ عضو فاسد کو قطع کردینا ہی بعض اوقات باقی جسم کے لئے باعث رحمت ہوا کرتا ہے) بلاشبہ (اے پیغمبر اسلام!) تمہارا پروردگار بڑا ہی غالب اور رحمت والا ہے۔

ان کی ہلاکت، رحمت خداوندی کا تقاضا اس لئے تھی کہ خدا نے تمام نوع انسانی کی پرورش کے لئے سامان رزق کو سطح ارض پر بکھیر رکھا ہے لیکن مستبد قوتیں انھیں اپنے قبضے میں لے لیتی ہیں اور مخلوق خدا بھوکوں مرتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو ہزار سمجھایا بجھایا گیا کہ وہ دوسرے لوگوں کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کریں۔ لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ اب اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی تھیں یا تو ان لوگوں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا اور باقی انسانوں کو تباہ و برباد ہونے دیا جاتا۔ اور یا ان لوگوں کو راستے سے ہٹا کر عام انسانوں کو رزق کے سرچشموں تک پہنچنے دیا جاتا۔ رحمت خداوندی (خدائی ربوبیت عامہ کی اسکیم) کا تقاضا یہی تھا کہ ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹا کر رزق کو عام کردیا جائے۔

سورہ الشمس میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰھَآ ؁ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰھَا ؁
فَقَالَ لَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْیٰھَا ؁ فَکَذَّبُوْهُ
فَعَقَرُوْھَا ؁ فَدَمْدَمَ عَلَیْھِمْ رَبُّھُمْ بِذَنْۢبِھِمْ
فَسَوّٰھَا ؁ وَلَا یَخَافُ عُقْبٰھَا ؁ (۹۱/۱۱-۱۵)

(اور دیکھو) قوم ثمود نے اپنی (ہرائی) سرکشی کے ساتھ سچائی کو جھٹلایا۔ جب ان کا بدبخت ترین (سرغنہ) کھڑا ہوا تو اللہ کے رسول نے (آخری اتمام حجت کے طور پر) خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی اور اس کے پانی پینے (کی باری) کے متعلق کہا۔ چنانچہ انھوں نے رسول کو جھٹلایا اور اونٹنی کو ہلاک کر ڈالا۔ بالآخر ان کے جرائم کی وجہ سے ان کے پروردگار نے ان پر تباہی بھیجدی (اور ایسی تباہی بھیجی کہ) انھیں (تہس نہس کرکے زمین کے) برابر کردیا اور خدا جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا قانون مکافات کسی کو پکڑتا ہے تو) خدا اس خیال سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟

آپ آخری آیت پر غور فرمالیجئے اور دیکھئے کہ اس میں خدائے کائنات کی سطوت و جبروت اور اس کے قانون کی ہمہ گیری و نفاذ پذیری کس شوکت و اجلال سے ہیبت فگن اور لرزہ انگیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی بذ نبہم کا ٹکڑا ابھر ابھر کر گواہی دے رہا ہے کہ یہ شان جبروت و کبریائی (معاذ اللہ) ایک مستبد و مطلق العنان بادشاہ کی لاپروائی اور بے حسی کی مظہر نہیں بلکہ اس قوت و اقتدار کی آئینہ دار ہے۔ جس کی رو سے نظام کائنات اس نظم و ضبط اور عدل و انصاف سے چل رہا ہے جس میں ایک ذرۂ بے مقدار سے لے کر عظیم الشان کرۂ تک ذرا سی خلاف ورزی احکام کی مجال نہیں رکھتے۔ اور جب اس کے نظام عدل کی یہ کیفیت ہے تو انسانی اعمال قانون جزا و سزا کی گرفت سے کب باہر جاسکتے ہیں؟ اور جب اس قانون کے ماتحت اس کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو اس پر کسی قسم کے جذبات اثر انداز نہیں ہوسکتے کہ وہ جہاں رحمٰن و رحیم ہے وہاں مالک یوم الدین بھی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ذرا اس پردۂ ساز کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس کا مالک یوم الدین (قانون مکافات عمل کا حاکم مطلق) ہونا بھی دراصل اس کی رحمت ہی کا ایک شائبہ ہے۔ اگر قانون مکافات اس طرح بے لوث طریق پر نافذ العمل نہ ہو تو کائنات میں فساد برپا ہوجائے۔ لہٰذا ولا یخاف عقبہا وہ محور عظیم ہے جس کے گرد تمام نظام کائنات گردش کر رہا ہے۔ خارجی کائنات بھی اور خود انسانوں کا معاشرتی اور اجتماعی نظام بھی۔

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ان لوگوں سے تین دن پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ ہلاکت بہت قریب آرہی ہے۔ یعنی حضرت صالحؑ کو اس آنے والے حادثہ کا علم پہلے سے دیدیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ اپنی جماعت مومنین کو ساتھ لے کر ان لوگوں سے کنارہ کش ہوکر کسی محفوظ مقام کی طرف چلے گئے۔

فَتَوَلّٰی عَنْھُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ
نَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ؁ (۷/۷۹)

پھر صالح ان سے کنارہ کش ہوگیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی۔ مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص و امتیازات اور زمانۂ جاہلیت کی حیاتِ عقلیہ کی کیفیت بیان ہو چکی ہے۔ عربوں کی حیاتِ عقلیہ کے مظاہر میں سے لغت اور زبان کا بیان ہوا تھا۔ آج کی صحبت میں ان کی شعر و شاعری کا ذکر جاری ہے جس کا آغاز ۱۰ اگست کی اشاعت سے ہوا تھا۔

بہرحال یہ دشواری اپنی جگہ پر موجود ہے کہ کسی مصنف نے عربوں کے ایسے اشعار نقل نہیں کئے جن سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ عربوں نے ابتداً کس طرح اشعار کہنا شروع کئے تھے اور پھر آہستہ آہستہ وہ ترقی کی اس منزل تک کیسے پہنچے جہاں ہم انھیں دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ادیبوں کو اس نمونہ کے اشعار پسند نہیں آتے تھے اور وہ انھیں چھوڑ دیتے تھے۔ اگر انھیں ایسے اشعار کے وزن میں کوئی کمزوری نظر آتی تھی تو وہ اسکو درست کر دیتے تھے۔ اس طرح تاریخی معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ ضائع ہو گیا۔

اگر ہمارے پاس وہ ذخیرہ موجود ہوتا جس میں انتخاب سے کام لینے کے بجائے صحتِ نقل کا زیادہ خیال رکھا جاتا تو وہ بہت سی چیزوں کی تحقیق کرنے کا ایک صحیح ذریعہ بن سکتا تھا۔ انہی چیزوں میں سے حیاتِ عقلیہ بھی ہوتی اور اس سے اس کا صحیح صحیح پتہ لگ سکتا۔ تاہم جو کچھ ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اس سے بھی تھوڑا بہت پتہ ضرور چل سکتا ہے — اگرچہ وہ کافی نہیں ہے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں — جو مجموعے ہمارے پاس موجود ہیں ان میں سے مشہور ترین وہ مجموعے ہیں جو زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں — علماء نے شعراء کے دواوین کو انہی میں سے شمار کیا ہے۔ جو یہ ہیں۔

(۱) معلقاتِ سبعہ۔ غالب گمان یہ ہے کہ ان کو حماد الراویہ نے جمع کیا ہے۔

(۲) مفضلیات۔ ان کو جمع کرنیوالے مفضل ضبّی ہیں یہ مجموعہ تقریباً ایک سو اٹھائیس قصیدوں پر مشتمل ہے۔

(۳) ابو تمام کا "دیوان الحماسہ" اس میں جاہلی شعراء کے بہت چھوٹے چھوٹے قطعات ہیں

(۴) ایسے ہی بحتری کا "حماسہ"

(۵)۔ "کتاب الاغانی" اور ابن قتیبہ کی "الشعر والشعراء" ان دونوں کتابوں میں جاہلی شعراء کے اشعار اور کثیر قطعات مل جاتے ہیں

(۶) ابن الشجری کی "مختارات"

(۷) ابو زید قریشی کا "جمہرۃ اشعار العرب"

جو اشعار زمانۂ جاہلیت کے ہم تک پہنچے ہیں ان میں سے جو قدیم ترین اشعار ہو سکتے ہیں وہ زمانہ بعثتِ نبوی سے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ متجاوز نہیں ہیں۔ ان اشعار کی طرف

اگر عام نظر سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ بیشتر ان کے موضوعات وغیرہ میں کوئی تنوع اور معانی و مضامین میں کوئی اچھوتا پن نہیں ہے ان کے جو قصائد نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں ان کی موسیقی یکساں ہی ہے جو ایک ہی نغمہ اور ایک ہی گت کو پیش کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات جو ان اشعار میں ملتی ہیں وہ زیادہ تر اکثر قصائد میں مکرر ہوتی ہیں۔ اختراع و نکتہ آفرینی کا بہت کم کہیں نام و نشان ملتا ہے۔ تنوع تو بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ ان چیزوں کو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ان باتوں کو دیکھکر ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔؟

شاعر خیال کرتا ہے کہ وہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر سفر کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک یا زیادہ رفقائے سفر ہیں۔ راستہ میں کہیں ان احباب کے نشانات پڑ جاتے ہیں جو اب وہاں سکونت پذیر نہیں رہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ان نشانات پر ٹھہراتا ہے اور اپنے ان احباب کے مکانات کے مٹے ہوئے نشانات پر خود بھی آنسو بہاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو بھی رلاتا ہے۔ وہ ان دنوں کو یاد کرتا ہے جو خوشگواری اور عیش و آرام کے ساتھ اس نے ان احباب کے ساتھ گذارے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ان احباب کے بغیر زندگی ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔ پھر وہ اپنی محبوبہ کا اجمالی یا تفصیلی بیان کرتا ہے۔ اور یہاں سے پھر وہ اپنی اونٹنی یا گھوڑے کی تعریف میں نکل جاتا ہے اور اسے پہاڑی بکرے شتر مرغ یا ہرن سے تشبیہ دینے لگتا ہے۔ یہاں سے پھر وہ یکبارگی سیر و شکار اور اس کی منظر کشی کی طرف نکل جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے بعد پھر وہ اس اصل موضوع کی طرف آتا ہے جس کے لئے اس نے یہ قصیدہ کہا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی شجاعت و بسالت کی تعریف کرنے لگتا یا اپنے قبیلہ کے گن گانے لگتا یا اپنے ممدوح کے محاسن شمار کرانے لگتا اور اسکی سخاوت کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ یا کسی ایسی جنگ کا تذکرہ کر کے جس میں اس کی قوم فتحیاب ہوئی تھی فخریہ اشعار کہنا شروع کر دیتا ہے۔ یا کسی قبیلہ کی مذمت اور ہجو کرنے لگتا ہے جس نے اس کے قبیلہ پر دست درازی کی تھی۔ یا پھر اپنی قوم کو انتقام لینے کے لئے جوش میں لاتا اور ابھارتا ہے۔ یا کسی مرنے والے کا مرثیہ پڑھتا ہے یہ — تقریباً وہ کل موضوعات ہیں جن میں جاہلی اشعار کہے گئے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ موضوعات نہایت محدود اور ان کا دائرہ نہایت ہی تنگ ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ صحرائی زندگی کا عکس یہی ہوتا ہے اور یہی بدوی زندگی کی سچی تصویر ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب کے شعراء نکتہ آفرینی اور اچھوتے مضامین پیدا کرنے سے زیادہ اظہارِ خیال اور لفظوں کے ساتھ کھیلنے پر زیادہ قدرت رکھتے تھے۔ ایک ہی مضمون کو مختلف شعراء نے نظم کا جامہ پہنا لیا ہے اور اسے مختلف قالبوں میں اس طرح ڈھالا ہے جسے دیکھکر آدمی تعجب سے انگشت بدنداں رہجاتا ہے۔ لیکن ان کی تخلیق و اختراع یا نکتہ آفرینیاں ہمیں محوِ حیرت نہیں کرتیں۔ عنترہ نے اس امر کو یوں ادا کیا ہے ؎

شعراء نے کہیں کوئی مکان چھوڑا ہے
یا اس وہم میں گرفتار ہو جانے کے بعد تم اس مکان کو
پہچان بھی سکتے ہو؟

یا مثلاً زہیر نے یوں کہا ہے ؎

"ہم کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ مانگے تانگے مضامین یا بار بار کہے ہوئے الفاظ ہی دہراتے رہتے ہیں۔"

مگر ان لوگوں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ شعراء تو بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں قدیم زمانہ سے لوگ شعر کہتے آتے ہیں مگر پھر بھی کہنے کی کافی گنجائش برابر رہی ہے۔ تر و تازہ تخیل برابر نکتہ سنجی و نکتہ آفرینیوں سے کام لیتا اور نت نئے موضوع اور اچھوتے مضامین پیدا کرتا رہا ہے جو ان سے پہلے کسی کو نہیں سوجھے لیکن ان لوگوں نے تو خود ہی اپنے اوپر تنگی کر لی یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے معیشتی حالات نے تنگیاں پیدا کر دیں اور انھیں بجز اس کے اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ وہ مانگے تانگے مضامین کو دہراتے رہیں۔

نہایت کمی کے ساتھ منتشر طور پر کہیں کہیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں شاعر نے کوئی اچھوتا مضمون پیدا کیا یا نکتہ آفرینی کا مظاہرہ کیا ہو۔ بہت ہی کم ایسے شعراء ہیں جو کسی خاص طرز کے موجد تھے جن میں ان کی اپنی شخصیت واضح طور پر نظر آتی ہو یا ان کے اشعار میں کوئی نیا سُر سنائی دیتا ہو۔ مثال کے طور زہیر کو پیش کیا جاسکتا ہے اس نے اپنی قوم کی اخلاقیت پر زیادہ زور دیا ہے اور اسکو نہایت سچائی کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔

جاہلی اشعار پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکثر شاعر کی شخصیت اس کے قبیلہ میں گم ہو جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنی مخصوص شخصیت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہ چیز عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اس میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شعر مل سکے گا جس میں شاعر کی اپنی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آسکی ہو یا جس میں اس نے کوئی ایسا لفظ کہا ہو جس کو اس کے اپنے وجدان کا پتہ لگ سکے۔ بمشکل ہی ایسا کوئی شعر مل سکیگا جسمیں وہ یہ احساس لائے کہ اسے قبیلہ سے الگ اپنے نفس کا کوئی جدا احساس اور شعور ہے۔

عربوں میں جب یہودیت و نصرانیت پھیل گئی تو دینی اور مذہبی طرز کے نئے نغمات نے جنم لیا۔ اس کا نمونہ حیرہ میں عدی ابن زید کے اشعار میں اور پھر طائف میں امیہ ابن ابی الصلت کے اشعار میں مل جاتا ہے

خلاصہ یہ کہ جاہلیت کے اشعار میں جیسا کہ انداز بیان کی مہارت اور حسن بیان کی ندرت کے اعلیٰ نمونے مل سکتے ہیں، تخیل کی وسعت و تنوع یا احساس و وجدان کی فراوانی کا پتہ اور نشان بھی نہیں مل سکتا۔

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

اب ہم اصل مثنوی کی طرف آتے ہیں اس کا پہلا شعر ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی است

یہ تمام عالمِ محسوسات خودی ہی کے اثرات اور کائنات کا وجود خودی ہی کی بنا ہے۔ خودی علت (CAUSE) اور کائنات معلول (EFFECT) ہے اور ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے سب خودی ہی کے رموز و اسرار ہیں۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد آشکارا عالمِ پندار کرد

خودی نے جب اپنے آپ کو بیدار کیا۔ جب اس میں شعورِ ذات پیدا ہوا تو اس سے فکر کی دنیا وجود میں آگئی۔ اقبال کے نزدیک تخلیق کا پہلا مرحلہ خودی کا شعورِ ذات حاصل کرنا ہے اور اس سے فکر کی دنیا پیدا ہوتی ہے۔

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او غیرِ او پیداست از اثباتِ او

خودی کی ذات میں سینکڑوں عالم پوشیدہ ہیں اور اس کے پہلو بدلنے سے نئی نئی دنیائیں وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اس شعر کے پہلے مصرع کا مطلب ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اقبال نے ایک ایسے تصور کی طرف اشارہ کیا ہے جو فلسفہ کی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا میں قدم قدم پر تضادات ملتے ہیں۔ روشنی کے مقابلہ میں اندھیرا۔ صحت کے مقابلہ میں بیماری آرام کے مقابلہ میں تکلیف۔ تریاق کے مقابلہ میں زہر۔ زندگی کے مقابلہ میں موت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آرام، لذت، روشنی، زندگی جیسی چیزیں خودی ہی کے آثار میں سے ہیں تو ان کے مقابلہ میں تکلیف، بیماری، تاریکی، موت وغیرہ کس کی پیدا کردہ ہیں؟ خیر و شر کی تخلیق کا مسئلہ بہت پرانا ہے اور اس کے متعلق ہر صاحبِ فکر نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ یہاں ہم فکر کی دنیا میں یہ گتھی لاینحل سمجھی جاتی ہے۔ یہ سوال بہت قدیمی اور مشہور ہے کہ "اگر خدا شر کو مٹانے پر قادر ہے لیکن اسے مٹاتا نہیں تو پھر وہ خدا خود مُبرّا محض نہیں۔ اور اگر وہ شر کو مٹانے پر قادر نہیں تو پھر اسے قادرِ مطلق نہیں سمجھا جا سکتا۔" یہی وہ عقدۂ مشکل تھا جسے حل کرنے کے لئے مجوسیوں نے تاریکی اور روشنی کو دو مستقل قوتیں تسلیم کر لیا۔ جو کائنات میں ہر وقت برسرِ پیکار ہیں۔ ان کے نزدیک کارگہِ ہستی اہرمن و یزدان کی ستیزہ کاری ہی کا دوسرا نام ہے۔ دوسری طرف ہیگل کا فلسفۂ اضداد ہے جس کی رو سے ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ یعنی اگر تاریکی نہ ہو تو ہم روشنی کو روشنی کہہ ہی نہیں سکتے۔ اس فلسفہ کی رو سے خیر کو خیر سمجھنے کے لئے اس کے مقابلہ میں شر کا وجود لاینفک ہے (یہ مسئلہ بڑا مشکل اور گہرا ہے جس کے حل کرنے کا یہ مقام نہیں۔ اسے معارف القرآن کی آئندہ جلد کے ایک باب میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس جلد کا عنوان ہے "انسان نے کیا سوچا" یہ کتاب آجکل پریس میں ہے) بہرحال اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ خودی جب اپنا اثبات کرتی ہے تو اس سے اس کا غیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح

در جہاں تخمِ خصومت کاشت است خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

خودی نے دنیا میں عداوت اور خصومت کا بیج بو دیا ہے۔ اس خصومت کی وجہ یہ ہے کہ خودی اس شے کو جو خود اس سے پیدا ہوتی ہے اپنے سے غیر تصور کر لیتی ہے اور اس کے بعد خودی میں اور اس شے میں مسلسل جنگ جاری رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ خودی ایسا کیوں کرتی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ

سازد از خود پیکرِ اغیار را تا فزاید لذتِ پیکار را

خودی کے استحکام و ارتقا کا راز مسلسل جدوجہد میں ہے۔ لیکن یہ جدوجہد اسی صورت میں ممکن ہے کہ خودی کے مدمقابل کوئی غیر بھی ہو۔ لہٰذا خودی اس کشمکش کو پیدا کرنے اور اس طرح اپنی لذتِ پیکار کو بڑھانے کے لئے خود اپنے غیر کو وجود میں لے آتی ہے۔ اور اس طرح اپنی قوت کا امتحان کرتی رہتی ہے۔

می کُشد از قوتِ بازوے خویش تا شود آگاہ از نیروے خویش

خودی اپنے غیر کو پیدا کرتی ہے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ اور اس طرح اپنے قوتِ بازو کا امتحان کرتی رہتی ہے۔

یہ نکتہ کہ جسے ہم اپنے سے غیر سمجھتے ہیں۔ اس کا وجود خود ہمارا ہی رہینِ کرم ہوتا ہے اقبال کے ہاں جگہ جگہ ملے گا۔ چنانچہ وہ ابلیس کے متعلق لکھتا ہے۔

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند

بغیر از جانِ ما سوزے کجا بود ترا از آتشِ ما آفریدند

مجوسی فلسفہ کے تتبع میں ہندو فلسفہ میں بھی روح اور مادہ (آتما اور پراکرتی) کو دو مستقل قوتیں تصور کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ مادہ روح کے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا رہتا ہے اس لئے مادی دنیا کو ترک کر کے روحانی ترقی حاصل کرتے جانا ہی مقصدِ زندگی ہے۔ روح اور مادہ کی اس کشمکش کے متعلق علامہ اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں کہ زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یا نیچر ہے۔ لیکن نیچر شر نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تو وہ ذریعہ ہے جس سے زندگی کی پوشیدہ قوتیں ظہور میں آتی رہتی ہیں۔

بہرحال اقبال کے نزدیک خودی خود ہی اپنے سے غیر کو وجود میں لاتی ہے اور پھر اسے اپنا غیر سمجھ کر اس سے مصروفِ کشمکش ہو جاتی ہے۔ اور اس کی شکست میں اپنی کامیابی سمجھتی ہے۔ یہ اس کی خود فریبی ہے لیکن

خود فریبی ہائے او عینِ حیات ہمچو گل از خوں وضو عینِ حیات

خودی کا اس طرح سے اپنے آپ کو فریب دے لینا ہی تو عینِ زندگی ہے۔ جس طرح پھول کے لئے خون سے غسل کرنا اصلِ حیات ہے۔ خودی کا انداز یہ ہے کہ

بہرِ یک گل خونِ صد گلشن کند از پئے یک نغمہ صد شیون کند

ایک پھول کے نشو و ارتقا کی خاطر وہ سینکڑوں گلستانوں کو برباد کر دیتی ہے۔ وہ محفلِ کائنات میں ایک نغمہ کے اضافہ کے لئے سینکڑوں گھروں کو ماتم کدہ بنا دیتی ہے۔ آپ کائنات کی تخلیق اور اس کے ارتقائی منازل پر غور کیجیے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ فطرت کو کسی ایک شے کے حسن کو نکھارنے کے لئے کتنے سیلاب اور زلزلے لانے پڑتے ہیں۔ کس قدر کشت و خون اور تاخت و تاراج کرنا پڑتا ہے۔ کس قدر توانائیوں اور ساز و یراق کو ضائع کرنا پڑتا ہے۔ اس کے متعلق اقبال کہتا ہے کہ

یک فلک را صد ہلال آوردہ است بہرِ حرفے صد مقال آوردہ است

وہ ایک آسمان کی رونق کے لئے سینکڑوں ہلال وجود میں لاتی ہے اور ایک نیا حرف پیدا کرنے کے لئے سینکڑوں باتوں کو پیدا کر کے انہیں ضائع کرنا پڑتا ہے۔ لیکن

عذرِ ایں اسراف و ایں سنگیں دلی خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

سوال یہ ہے کہ اس قدر اسراف اور اس کی اتنی سنگدلی کے لئے وجہ جواز کیا ہے۔ وجہ جواز یہ ہے کہ اس کے بغیر نہ تو نئی نئی چیزوں کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی کائنات کا حسن اپنی تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔

واضح رہے کہ آغازِ تخلیق ارتقائے کائنات اور خیر و شر کے متعلق جو کچھ اقبال نے کہا ہے وہ محض فلسفیانہ گفتگو ہے۔ ورنہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے۔ وہ اس باب میں بڑی صاف اور سادہ بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا آغاز اللہ کے عظیم پروگرام کے مطابق اس کے امر سے ہوا۔ یہ اسی کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ارتقائی منازل طے کرتی جا رہی ہے۔ خیر وہ ہے جو اس قانون کے مطابق ہو اور شر وہ ہے جو اس کے خلاف جائے۔

اقبال اور قرآن

از: پرویز

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

قیمت: دو روپے

عورت کا قرآن

(۲۴)

لونڈی سے نکاح

نکاح کے سلسلہ میں دو طرح کی عورتوں کا ذکر آیا ہے ایک "آزاد" دوسری لونڈی۔ یعنی اگر آزاد عورت سے نکاح نہ کر سکو تو لونڈی سے نکاح کر لو۔ قرآن مجید میں اور مقامات پر بھی "غلام" اور "لونڈی" کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ ذرا وضاحت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

• غلام اور لونڈی کے ذکر سے ہمارے فقہا اور علماء نے یہ سمجھ اور فرض کر لیا ہے کہ اسلام نے غلامی کو جنگ کی حد تک ہمیشہ اور برابر کے لئے جائز رکھا ہے۔ یعنی اگر مسلمان اور غیر مسلموں میں جنگ ہو اور کامیابی کے سلسلہ میں کچھ بدنصیب "مرد اور عورتیں" مسلمانوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو جائیں تو جس طرح پہلے مرد غلام اور عورت لونڈی بنائے جاتے تھے۔ اسی طرح اب بھی اور ہمیشہ بنائے جا سکتے ہیں۔ نیز ان حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ ان لونڈیوں سے بلا نکاح یا بلا ادائے مہر بیوی کے فرائض بھی ادا کرائے جا سکتے ہیں۔ یہ خیال، یہ عقیدہ، یہ مفروضہ اور یہ اصرار محض غلط اور سراسر لغو و باطل ہے۔ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہر حالت میں قطعاً منسوخ ختم اور کالعدم کر دیا ہے اور چونکہ دوسری شق کا دارومدار اور انحصار پہلی شق ہی پر ہے۔ لہٰذا وہ بھی سرے سے مہمل ہے۔ اسلام کی تعلیم کی رو سے کبھی بھی اور کسی حالت میں بھی، کوئی "مرد غلام اور کوئی عورت لونڈی" نہیں بنائی جا سکتی۔ اور اس طور پر لونڈی کے نکاح کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے فی زمانہ یا آئندہ کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یا نہیں ہو سکتا ہے چونکہ "عورت" پر یہ ایک ایسا ذلیل جبر ہے۔ جس سے قدرت نے تو عورت کو نجات دیدی ہے۔ مگر ہمارے فقہا اور علماء اس لعنت کو قائم اور جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں یہاں ذرا تفصیل سے گفتگو کروں گی۔

قرآن مجید کے نزول کے وقت عرب میں غلامی کا عام رواج تھا۔ اس لئے مسلمانوں کے پاس بھی لامحالہ ایام جاہلیت کے لاتعداد غلام اور لونڈی موجود تھے۔ قرآن مجید نے "ماملکت ایمانکم" (غلام۔ لونڈیوں) سے، قطعی طور پر صرف عہد جاہلیت کے یعنی اسلام سے قبل کے وہ غلام اور لونڈی مراد لئے ہیں

• جو ملکیت میں آ چکے ہیں:

نہ یہ کہ "جو ملکیت میں اب آویں"؛ اسی لئے قرآن مجید نے ان کے متعلق ایسا طرز عمل اختیار کیا۔ جس سے وہ مجبور و بے بس مرد و عورت آہستہ آہستہ اسلام کے آزاد معاشرہ میں جذب ہوتے چلے گئے۔ کہیں خود ان کو حق دیا کہ وہ نقد یا کسی مدت کے اندر فدیہ ادا کر کے آزاد ہو جائیں۔ کہیں خود مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ کفاروں میں لونڈی غلام آزاد کر دیں۔ اسی طرح لونڈیوں کو بیوی بنا لینے کا حکم دے کر ان کو آزاد عورتوں کا سا درجہ دے دیا اور ایسا ربط پیدا کر دیا کہ ان کے مالکوں کو ان سے دماغی ہی نہیں دلی تعلق بھی پیدا ہو جائے۔ مگر چونکہ لونڈیوں، غلاموں کو آزاد کرنے اور سلسلہ مناکحت قائم کرانے سے بھی تمام غلاموں اور ساری لونڈیوں کی کھپت مشکل تھی۔ اس لئے عام طور پر ان سے حسن سلوک کا حکم دیا۔ تاکہ وہ انسانی مراعات سے محروم نہ رہنے پائیں۔ اور ان سے احساس کمتری کا مرض دور ہو جائے۔

ہندوستانی اور پاکستانی علماء ہنوز دعوے کرتے اور ابھی تک سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اسیران جنگ کو اب بھی "غلام" اور "لونڈی" بنایا جا سکتا ہے اور اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی عالم مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی فرماتے ہیں کہ:-

> اسلام نے ۔۔۔۔ غلامی کی صرف ایک صورت کو جائز رکھا ہے وہ یہ کہ جب مسلمانوں کے ساتھ مشرک و کافر برسر پیکار ہوں۔ اور امن و سلامتی کے بجائے فتنہ و فساد اور شر انگیزی کو مایہ خمیر بنا لیں تو وہ باغی قرار دیئے جا کر قید ہو جانے کے بعد "غلام" بنائے جا سکتے ہیں:

(اخلاق و فلسفۂ اخلاق صفحہ ۲۹۰)

پاکستانی عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بڑی طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں:-

> "اگر یونہی رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ وصول نہ ہو سکے اور دشمن اسیران جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہوں تو مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ انہیں غلام بنا کر رکھ لیں۔"

(تفہیمات حصہ دوئم صفحہ ۲۹۳)

دراصل یہ غلط فہمی شروع ہی سے چلی آ رہی ہے۔ اور اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی کہ متقدمین کی رایوں کا جائزہ لیا جائے۔ فی زمانہ لوگوں کے لئے یہ جاننا قطعاً ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ خدا نے کیا کہا ہے۔ رسول نے کیا فرمایا ہے۔ بلکہ صرف یہ ہے کہ متقدمین نے کیا لکھا ہے۔[2] چنانچہ خود مودودی صاحب نے یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے کے سوال پر جو کچھ جواب دیا تھا۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ان حضرات کے نزدیک صداقت کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

> اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے نقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے۔ لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں۔ اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔

(رسالہ ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۲ء)

یعنی اگر سلف سے خلف تک فقہائے امت "دو اور دو کو تین" کہتے آئے ہیں۔ تو فی زمانہ اس کے خلاف یہ رائے دینا مشکل ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اور پہلے کیا حال تھا؟ اس کا اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر سے کیجئے۔ وہ اپنی کتاب "ترجمان القرآن" جلد اول کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

> چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہو گئی اس دار عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا تھا۔ کسی پیشرو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟" (صفحہ ۱۴)

یہ قرآن مجید کی تفسیروں کا حال تھا۔ پھر بھلا فقہی مسائل کا کیا پوچھنا ہے۔ جب کہ خدا کے کلام کے مقابلے میں انسانی کلام کا کوئی درجہ نہیں ہے؟ اس "غلامی" کے مسئلے میں ہمارے علماء کا یہی حال ہے۔ چونکہ پہلے کے فقہاء نے ایسا ہی کہا ہے۔ اس لئے اب کے علماء بھی یہی کہہ رہے ہیں اور کوئی سوچ بچار کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ آمادہ ہوں کیسے جبکہ اس تقلید کے سبب مفت کے غلام ملتے ہیں اور مفت کی ایسی بیوی ہاتھ آتی ہے۔ جس سے نہ نکاح کرنا پڑے اور جس کو نہ مہر ادا کرنا پڑے؟ بہرحال سورۂ محمد کے پہلے رکوع میں کفار سے جنگ کے سلسلے میں ایک آیت ہے کہ اگر وہ لڑنے پر آمادہ ہوں۔

> فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ
>
> تو ان کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ جب تم ان کی خونریزی کر چکو تو خوب مضبوط باندھ لو؛

اسلامی معاشرت — مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ — قیمت دو روپے

۱؎ اخلاق؛ اسلام بلکہ عام انسانیت سے بھی گرا ہوا فعل ہے ۲؎ بجائے خود یہ بات جاننا بڑا اہم ہے کہ بزرگوں نے کیا کہا اور کیوں کہا، مگر ان متقدمین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ غلطی کر ہی نہیں سکتے۔ عجیب زبردستی ہے کیونکہ وہ انسان تھے۔ اور غلطی تقاضائے بشریت۔

مسند امام احمد بن حنبلؒ

(علامہ تمنا عمادی پھلواروی)

—— (۲) ——

اس اہم تحقیقاتی مضمون کی پہلی قسط طلوع اسلام کی اشاعت بابت ۶ اگست ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اب دوسری قسط پیش خدمت ہے۔ طلوع اسلام

عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابن حجر اور تمام ائمہ رجال ابوبکر شافعی کا نام لکھتے ہیں اور یہ ضرور عبداللہ بن احمد کے ساتھ کچھ مدت تک لگے لپٹے رہے۔ ابن جوزی ان کا مطلق ذکر ہی نہیں کرتے۔ البتہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۸۱ میں ان کا ترجمہ سپرد قلم فرمایا ہے مگر افسوس کہ وہ ان کی حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے اور نہ ان کو کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق کرید کرتے۔ ابن حجر غالباً ان کی حقیقت سے واقف ہو گئے تھے اس لئے ان سے قطع نظر ہی کرنا مناسب سمجھے۔ نہ تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر کیا نہ لسان المیزان میں، نہ تقریب میں نہ تعجیل المنفعۃ میں۔ تعجب یہ ہے کہ دولابی نے بھی الاسماء والکنیٰ میں ان کا ذکر نہ کیا۔ البتہ سمعانی نے ان کو کتاب الانساب میں یاد کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ مقام جبل میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی اس لئے جبلی بھی اپنے آپ کو لکھتے ہیں اور بغدادی بھی۔ یعنی کبھی یہ کبھی وہ لکھا ہے کہ عمر زیادہ پائی یہاں تک کہ دارقطنی نے بھی ان سے روایت کی ہے کہ ابو علی بن شاذان وغیرہ نے ایک بار مسجدوں میں سبّ صحابہؓ لکھا ہوا پایا۔ تو انھوں نے فوراً اپنی براءت کے لئے لوگوں کو فضائل صحابہؓ لکھوانا شروع کیا۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۳۵۴ھ میں مرے۔ دارقطنی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے الخ

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت

ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۲۲۸ میں محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابوبکر الشیبانی کا ترجمہ لکھا ہے اور لکھا ہے کہ ان کو زعم تھا کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل سے یہ روایت کرتے ہیں۔ مگر دارقطنی نے ان کو دجال کہا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ مجھے تو اس کا شبہ سا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر شافعی ہی ہیں جو دارقطنی کی توثیق و روایت کا ذکر جو سمعانی نے کیا ہے وہ کسی معتبر ذریعے سے سمعانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کافی تفحص و جستجو کرکے میں جس نتیجے پر ان کے متعلق پہنچا ہوں وہ حسب ذیل ہے

موسیٰ بن سہل الوشاء

یہ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے ابوبکر شافعی کے سب سے پہلے استاد موسیٰ بن سہل الوشاء تھے جن کو عقیلی نے غیر مشہور، دارقطنی نے ضعیف اور برقانی نے ضعیف لکھا ہے ابن علیہ کے یہ سب سے آخری شاگرد تھے ۲۷۸ھ میں وفات پائی

محمد بن شداد المسمعی

جب ابوبکر شافعی موسیٰ بن سہل کی آغوش تربیت سے بقضائے الٰہی محروم ہو گئے تو محمد بن شداد المسمعی کی گود میں آگرے اور ان سے تعلیم پانے لگے۔ ان کو بھی برقانی نے ضعیف، امام ذہبی نے معتزلی اور منکر الحدیث اور دارقطنی نے ضعیف ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

درحقیقت ابوبکر شافعی کی پوری دماغی پرورش انھیں دونوں وشاء و مسمعی کی آغوش تربیت میں ہوئی ۲۶۰ھ میں ابوبکر شافعی پیدا ہوئے اور ۲۷۲ھ سے وشاء کی خدمت میں پہنچ گئے، یعنی ۱۲ سال ہی کی عمر سے۔ گذشتہ دو اساتذہ کے علاوہ

محمد بن سعید البورقی

محمد بن سعید البورقی کے بھی یہ شاگرد رشید ہیں یہ بورقی صاحب وہی ہیں جو سلیمان بن جابر سے روایت کرتے ہیں اور مشہور و معروف وضاع ہیں، یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔ اور پھر

محمد بن یونس الکدیمی

محمد بن یونس الکدیمی، جو جانے بوجھے کذاب اور افترا پرداز ہیں۔ ان کے بھی یہ نہایت خاص شاگرد ہیں اور اسی قسم کے

ابوبکر شافعی کے بعض دیگر شیوخ

چند اور مشائخ محمد بن احمد بن نصر ابو جعفر الترمذی، اسحٰق بن ابراہیم بن سنین الختلی جن کی کتاب الدیباج مشہور ہے۔ محمد بن ہارون بن بریۃ الہاشمی سعید بن ہاشم الطبری، ابو عمارۃ محمد بن احمد بن مہدی، محمد بن الحسن بن محمد بن سماعۃ الحضرمی، ابراہیم بن محمد بن اسمٰعیل المسمعی البصری اور انھیں جیسے بعض دیگر مجروحین و متروکین و ضعفاء کے حلقۂ فیض سے یہ استفاضہ کرتے رہے۔

مگر درحقیقت یہ بورقی اور کدیمی کی تیار کردہ ایک پوشیدہ پارٹی تھی جو ایک پوشیدہ گہری سازش کے تحت باہم تقسیم کار صحابہؓ و اکابر تابعین بن کر کے ان کے ناموں سے موضوعات کا انبار لگا رہی تھی اور اس کے لئے ابوبکر شافعی تیار کئے گئے تھے کہ یہ عبداللہ بن احمد کے پاس آ جائیں اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لیں تاکہ عامۂ محدثین ان کو عبداللہ کا شاگرد جان جائیں۔

یہ باوجود عبداللہ بن احمد کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے حنبلی نہ بنے بلکہ شافعی بنے رہے اور اپنے کو حنبلی نہیں بلکہ شافعی مشہور کیا، تاکہ دونوں فرقوں سے تعلقات رہیں۔ مگر یہ ابوبکر شافعی صاحب اصل شیعہ امامیہ تھے اور تقیۃً اپنے

ابوبکر شافعی دراصل شیعہ تھے

کو شافعی مشہور کئے رہے اور تقیۃً ہی کر کے عبداللہ بن احمد کے شاگرد بھی بنے تھے۔ اب اس دعوے کی دلیل اور اجمال کی تفصیل یوں سنئے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ابوبکر شافعی

ان ابوبکر شافعی صاحب کا پورا نام امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ دیکھئے جلد ۳ صفحہ ۹۱۔ محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ البغدادی۔ انھوں نے اہل سنت کو دھوکا دینے کے لئے جس طرح مسلک شافعی بظاہر اختیار کر کے اپنے ساتھ شافعی کی نسبت کو شہرت دے رکھی تھی اسی طرح اپنی اصلی کنیت جو ابوالحسن تھی، اہل سنت کو دھوکا دینے کے لئے ابوبکر سے بدل کر مشہور کر رکھی تھی اور اسی طرح ابوبکر شافعی کے لقب سے مشہور و متعارف رہے۔ یہ بھی خوب یاد رکھئے کہ ان کے پردادا کا اصلی نام یوسف تھا مگر انھوں نے عبدویہ لقب دیکر اہل سنت میں مشہور کیا۔ اسی لئے شیعوں کی بعض کتب رجال میں ان کا نام یوں ہے۔ "محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب یکنیٰ ابا الحسن"

خلاصۃ الاقوال میں ابوبکر شافعی

جیسا کہ خلاصۃ الاقوال میں علامہ حلی مشہور محدث شیعہ نے لکھا ہے اور اس طرح ان کا نام تحریر فرما کر لکھتے ہیں کہ "قال احمد بن عبدون ہو ابوبکر الشافعی مولدہ سنۃ ۲۶۰ الحسینیۃ وکان علی الظاہر یتفقہ علی مذہب الشافعی ویری رأی الشیعۃ الامامیۃ فی الباطن وکان فقیہا علی المذہبین ولہ علی المذہبین کتب یعنی احمد بن عبدون نے فرمایا کہ وہ ابوبکر شافعی ہیں، ان کی ولادت حسینی سال کے حساب سے ۲۶۰ھ میں ہوئی اور یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے مگر باطن میں شیعۂ امامیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں مذہب کے فقیہ تھے اور دونوں مذہب پر ان کی کتابیں ہیں۔ دیکھئے خلاصۃ الاقوال صفحہ

منتہی المقال میں ابوبکر شافعی

اور دوسرے شیعہ محدث امام فن رجال ابو علی محمد بن اسمٰعیل بن عبدالجبار اپنی کتاب منتہی المقال میں لکھتے ہیں کہ "ابوبکر الشافعی ہو محمد بن یوسف کذا فی المجمع ولعلہ ینسب تارۃ الی ابیہ وتارۃ الی جدہ وذکرہ من طبقۃ ثقاتہم" یعنی ابوبکر شافعی، وہ محمد بن یوسف ہیں۔ ایسا ہی کتاب المجمع میں ہے۔ شاید ان کی نسبت کبھی ان کے باپ کی طرف کی جاتی ہو اور کبھی ان کے دادا کی طرف۔ یعنی کسی نے محمد بن ابراہیم کہا اور کسی نے محمد بن یوسف کہہ دیا۔ اور لوگوں نے ان کو ثقہ راویوں کے طبقہ میں ذکر کیا ہے۔"

۱۔ یعنی محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب جن کی کنیت ابوالحسن ہے جیسا کہ ابتدائے ترجمہ میں علامہ حلی نے لکھا ہے۔ ۲۔ حسینی سال کی تفصیل میری کتاب تطہیر آیت التطہیر میں ہے مختصراً صفحہ ۱ کے حاشیہ پر دیکھئے۔

علامہ مجلسی کی الوجیزہ

علامہ مجلسی تیسرے مشہور شیعہ مجتہد و محدث اپنی کتاب الوجیزہ میں لکھتے ہیں "محمد بن ابراہیم بن یوسف ح" شیعوں کی کتب رجال میں کسی نام کے بعد ح کی علامت جو بنی ہوتی ہے، وہ ممدوح کا مخفف ہے۔ خود مصنفین کتب رجال شیعہ نے اس کی تصریح کردی ہے دیکھئے وجیزہ صفحہ ۱۶۲۔ مگر اسی رسالہ کے باب الکنیٰ میں ابوبکر شافعی

ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی

کے عوض "ابوبکر القتانی" لکھ کر وہی علامت ح کی بنا دی ہے جو ان کے نام کے ساتھ بنائی ہے، اور ابوبکر شافعی کا ذکر باب الکنیٰ میں نہیں کیا۔

شرح تصریحات علمائے شیعہ

علامہ حلی اور صاحب منتہی المقال نے ابوبکر شافعی کی نشان دہی کی، مگر علامہ مجلسی نے نام کی تصریح تو کی، مگر کنیت کا مطلق ذکر ہی نہ کیا، صاف کھا گئے! "ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی" لکھ کر اس طرح اس پر پردہ ڈالا کہ کسی کا ذہن ہی نہ جائے کہ یہ ابوبکر شافعی ہی ہیں اور ان تینوں نے مل کر ابوبکر شافعی کے باپ کا نام یعنی عبداللہ کو درمیان سے بالکل غائب ہی کر دیا۔ یا ممکن ہے کہ ابوبکر شافعی نے خود ہی تقیہ کے ماتحت اہل سنت کو اپنا سلسلہ نسب بتانے میں ایک نام عبداللہ کا بڑھا دیا ہو۔ واللہ اعلم پھر کوئی تو محمد بن ابراہیم بن یوسف لکھتا ہے اور کوئی صرف محمد بن یوسف۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ خود صاحب منتہی المقال نے یہ گتھی اس طرح سلجھا دی کہ کوئی ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی ان کو ان کے دادا کی طرف۔ مگر ان کے دادا یا پڑدادا کا لقب جو عبدویہ انھوں نے خود دے رکھا تھا، ان کو ان میں سے کوئی بھی نہیں لکھتا تماشا یہ ہے کہ سال وفات کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا جاتا۔ صرف علامہ حلی سال ولادت لکھتے تو ہیں مگر متعارف طریقہ جو سال ہجری کا ہے اس سے گریز کرکے ایک بالکل غیر متعارف چیز یعنی سال حسینی[1] کے حساب سے، جس سے علمائے اہل سنت تو کجا، شیعوں میں سے بھی خاص خاص ہی لوگ واقف ہیں۔ اس طرح کی تدلیس یعنی ناموں میں ادل بدل شیعی علماء بہت کیا کرتے ہیں کہ علمائے اہل سنت اگر یہ کہیں کہ یہ تو شیعہ ہے تو جواب میں کہہ دیا جائے کہ نہیں تو شیعہ تو دوسرا ہے، جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں وہ سنی ہے۔ چنانچہ دونوں کے ناموں میں کافی فرق موجود ہے۔ آپ کا ابوبکر شافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ ہے جس کی ولادت سنہ ۲۶۰ھ کی اور ہمارا ابوبکر شافعی محمد بن ابراہیم بن یوسف یا محمد بن یوسف ہے جس کا سال پیدائش سنہ ۲۸۱ ہے باقی رہا سال حسینی، تو اگر امام حسینؓ کی ولادت سے بھی لیجئے، تو سال ہجری سے بھی کم ہی ہوگا نہ کہ اکیس برس آگے، اس لئے یہ دوسرے ہی ابوبکر شافعی ہیں جو پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے اس کے بعد شیعہ امامیہ مذہب

علمائے شیعہ کی تدلیس

اختیار کر لیا، مگر پہلے لقب سے مشہور رہ گئے اس طرح کی تدلیس شیعہ حضرات ہمیشہ کرتے رہتے ہیں، مثالاً ملاحظہ ہو۔

مندل بن علی الغزی

مندل بن علی الغزی اہل سنت کی کتابوں میں ایک شیعہ راوی ہے، مگر شیعوں نے ان کو اپنی کتابوں میں مبدّل بن علی العتری لکھا ہے اور تصریح کردی کہ مبدّل بائے موحدہ تحتانیہ سے اور العتری تائے مثناۃ فوقانیہ و رائے مہملہ سے تاکہ دونوں دو شخص سمجھے جائیں اور مندل کے حقیقی بھائی حبان بن علی الغزی کو صرف حیان

حبان بن علی الغزی

بنا کر تصریح کردی کہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے اور بس یہاں غزی کو عتری نہیں بنایا، تاکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی بھی نہ سمجھے جائیں۔ دونوں کے نام بھی کتابوں میں اتنے فاصلے سے درج ہوتے ہیں کہ دونوں میں کسی مناسبت کا خیال بھی نہ جاسکے گا۔ مندل کا نام باب المیم میں بہت بعد کو آئے گا اور حیان کا نام باب الحاء المہملہ میں کتاب کے دوسرے ہی ربع میں موجود ہوگا۔

اسی طرح ابوجعفر بن جریر بن یزید الطبری جن کی تفسیر اور تاریخ مشہور ہے اور جو بالاتفاق شیعہ تھے۔ ان کو ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری لکھ دیا۔ تاکہ اہل سنت دونوں کو دو شخص سمجھ لیں چنانچہ سمجھے، اور امام ذہبی و ابن حجر جیسے علمائے رجال دونوں کو دو سمجھتے رہے، حالاں کہ رستم طبرستان کا رہنے والا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام یزید رکھا گیا۔ ابن جریر نے خود یہ تدلیس کی کہ جو کتابیں خاص شیعوں کے لئے لکھیں، اس میں اپنے دادا کا نام رستم ہی رہنے دیا اور جو کتابیں عام مسلمانوں کے لئے تصنیف کیں ان میں اپنے دادا کا نام یزید لکھا۔ شیعوں کے لئے جو کتابیں لکھیں وہ عام نگاہوں سے اس وقت تک پوشیدہ رہیں جب تک ایران میں صفویہ حکومت قائم نہ ہوئی تھی۔ جس طرح شیعوں کی تمام خاص کتابیں اور مخصوص عقیدے اس سے پہلے تک برابر پردۂ کتمان میں رہے۔ ابن جریر کی خالص شیعی تصنیفیں بھی نہاں خانہ کتمان ہی میں محفوظ رہیں۔ حکومت صفویہ کے استحکام کے ساتھ ہی ساری پوشیدہ چیزیں منصۂ شہود پر آگئیں۔ اور شیعے اپنے اصلی عقیدے اور حقیقی رنگ و روپ میں نمایاں ہو گئے اس وقت اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ابن جریر کی تصنیفات سے اہل سنت بدظن ہو کر اس کو حجت و سند نہ سمجھیں، تو پھر جو جو تخم ریزیاں ابن جریر اپنی اس تفسیر و تاریخ میں کر گئے ہیں بارآور نہ ہوسکیں گی، اس لئے فوراً علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں ایسی تصریحیں لکھنا شروع کردیں، جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ ابن جریر ایک نہیں بلکہ دو تھے اور وہ علماء و عقلائے شیعہ جو ایران سے باہر اہل سنت کے ساتھ گھلے ملے تھے اہل سنت میں زبانی اس کا پروپیگنڈا بھی کرتے اور یہ ایک خیال اہل سنت کو بھی ایسا رہا کہ اگر کسی چیز کو ہم غلط فلاں صحیح اور حقیقی وجوہات کی وجہ ہی سے ہی مگر رد کر دیتے ہیں۔ یا مشتبہ و غیر مستند مان لیتے ہیں تو پھر یہ چیز ہمیشہ کے لئے ہمارے ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور ایسی دوسری چیز ہمارے پاس ہے نہیں جو اس کا نعم البدل ہو۔ اس لئے ہم ان صحیح و واقعی وجوہات سے چشم پوشی کر نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ بر بنائے ضرورت اس کی واقعیت ہی سے انکار کر دیں گے، مگر اس دولت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے یہ حلوائے بادام کی قاب فی الجملہ زہر آلود ہی سہی مگر ہے تو حلوائے بادام۔ اس کی زہر آلودگی سے انکار کرکے تھوڑا تھوڑا کھاتے رہیں تو اس کا مزا تو آتا رہے گا۔ ہوس تو مٹے گی۔ زہر آلود سمجھ کر واپس کر دینے سے ہوس اور ستائے گی اور یہ یاد کرکے کہ ہائے کیا خوش رنگ اور خوشبودار حلوا تھا اور بھی رہ رہ کے طبیعت بے چین ہوگی۔ بس یہی وجہ تھی کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری کو بھی اہل سنت نے گلے لگایا اور مسند امام احمد کو بھی اور اسی طرح سنن نسائی مستدرک حاکم وغیرہ کو بھی۔

رجوع بسوئے مقصد

غرض اتنی تفصیل کے بعد آپ کو ابوبکر شافعی کی پوری حقیقت معلوم ہوگئی، کہ یہ شخص درحقیقت شیعہ تھا اور تقیہ کرکے شافعی بنا ہوا عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگا رہا۔ اور اس کی پیٹھ پر وہ کیدی اور بورقی والی پارٹی تھی، جو درحقیقت بالکل اسی کی طرح تقیہ باز تھی

تصریح سلسلہ تالیف مسند

اور وہ سب کے سب شیعے ہی تھے مگر اہل سنت بنے ہوئے۔ عبداللہ بن احمد کی وفات کے بعد اپنی پارٹی کی جھوٹی سچی جمع کردہ روایات کو یکجا کرکے پورا ذخیرہ حدثنا عبداللہ حدثنی ابی لکھ لکھ کر مرتب کر ڈالا۔ (یہ شخص تھا بڑا لکھاڑ اور خوشخط، چنانچہ شیخ حلی نے ان کے نام کے ساتھ الکاتب کا لفظ لکھا بھی ہے۔) اور اس کی متعدد نقلیں بھی اپنی جماعت کی مدد سے اس نے مہیا کرلیں۔ مگر فوراً اس کی اشاعت ہوتی تو پھر عبداللہ کے دوسرے تلامذہ نہایت سختی کے ساتھ تکذیب کرتے اس کا ڈر لگا ہوا تھا، اس لئے جب تک عبداللہ کے تمام بڑے بڑے تلامذہ ایک ایک کرکے راہی جنت نہ ہو لئے اس وقت تک تو کسی سے مسند امام احمد کا نام تک نہ لیا گیا۔ یہاں تک کہ اسی انتظار میں ابوبکر شافعی خود ہی سنہ ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہونے لگے اور ابھی طبرانی جیسے جلیل القدر محدث متوفی سنہ ۳۶۰ھ عبداللہ بن احمد کے شاگرد رشید موجود تھے۔ آخر ابوبکر شافعی نے مرتے وقت ابوبکر قطیعی کو یہ امانت سپرد کر دی اور بزبان حال کہا کہ۔

سپردم بتو مایۂ خویش را الخ

قطیعی تو ابوبکر شافعی کے ساتھ رہتے ہی تھے اور انھیں کے تربیت یافتہ و ہم مسلک و ہم خیال، پھر سن شعور کے بعد سے برابر شریک کار بھی رہے یعنی برابر ترتیب مسند میں بھی ابوبکر شافعی کے معین و مددگار رہے، اس لئے انھوں نے اس مہم کو اپنے ذمے بشوق تمام لے لیا، اور اب کام ہی کیا تھا۔ پکی پکائی کھیر تو سامنے تھی، صرف کھا لینا تھا۔ طبرانی کے انتقال کے بعد یہ ادھر ادھر گھومنے لگے مگر پھر بھی کہیں مسند امام احمد کا نام لینے کی ہمت نہیں

---

[1] سال حسینی کا حال مجھ کو اخی الاعظم حضرت مولانا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواروی سے اور ان کو نواب محسن الملک سے معلوم ہوا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ انھی اس کی پوری تفصیل اپنے رسالے تطہیر آیت التطہیر من دنس ہفوات الرواۃ فی التفسیر میں لکھ دی ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے اس کا اعادہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا آغاز بعثت نبویہ سے آٹھ سال پیشتر سے اہل تشیع کرتے ہیں۔ اور جس کی بنیاد ایک خواب بتاتے ہیں جو شیعوں کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم کو امام حسینؓ کے متعلق بعثت سے آٹھ سال پہلے دکھایا گیا تھا اور ان کے یہاں اس خواب کا اخفاء و کتمان بھی فرض ہے اور سال حسینی کا اخفاء بھی۔ مگر زندگی بھر میں واقف کاروں پر وہ ایک مرتبہ اس کا استعمال بھی واجب ہے۔ غالباً اسی بنا پر علامہ حلی نے یہاں استعمال کر لیا۔

پُر تھی۔ اپنے کو عبداللہ بن احمد کا شاگرد بھی مشہور کر ہی چکے تھے اور لوگوں نے تسلیم بھی کر لیا تھا کہ عبداللہ کے آخر وقت میں کچھ حدیثیں ان سے سنی ہوں گی۔ ۱۶-۱۷ سال کی عمر محض بچپن کی عمر نہیں۔

پھر جس طرح ابوبکر شافعی کو یہ ابوبکر قطیعی مل گئے تھے، بالکل اسی طرح ابوبکر قطیعی کو بھی "جوئندہ یابندہ" کے مطابق آخر ایک ہم راز شاگرد ابن المذہب مل ہی گیا، جو درحقیقت منافقت میں ابوبکر شافعی اور ابوبکر قطیعی دونوں کا ہم مذہب تھا۔ اسی ابن المذہب نے مسند احمد کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ابوبکر قطیعی کے انتقال کے کم سے کم پچاس برس بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع گزر جانے کے بعد دیکھا کہ اب میدان بالکل صاف ہے۔ عبداللہ بن احمد ہی نہیں بلکہ ان کے اکابر تلامذہ کے دیکھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے۔ تکذیب کا خطرہ اب بہت زیادہ نہیں رہا، اس لئے اِدھر اُدھر مسند احمد کا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی سے بھی انھوں نے اپنے سلسلے کا ذکر کیا، جیسا کہ ابن حجر نے خطیب کا قول نقل کیا ہے مگر خطیب جیسا نقاد ابن المذہب کے دامِ تزویر میں کب آ سکتا تھا اگر واقعۃً خطیب کو ابن المذہب پر کچھ بھی اعتماد ہوتا، تو خطیب ضرور ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لے لیتے۔ خطیب ہی نہیں، بلکہ خطیب کے ہم عصر خدا جانے کتنے محدثین ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لیے ہوتے، مگر کسی نے بھی ان کے اس دعویٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ بخوبی ممکن ہے کہ خطیب اور اس وقت کے دوسرے محدثین نے ابن المذہب کی تکذیب بھی کی ہو مگر بعد والوں نے فقط مسند کا بھرم رکھنے کے لئے اس پر پردہ ڈال دیا، مگر عملی تکذیب پر کس طرح پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ اگر زبانی تکذیب کا کوئی ثبوت نہیں، تو یہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ خطیب اور اس وقت کے سارے محدثین نے عملی بے اعتنائی و بے توجہی سے درحقیقت ان کی تکذیب کر کے دکھا ہی دی۔ ذہبی و ابن حجر زبانی تکذیب کا ذکر نہ کریں مگر اس عملی تکذیب کو جو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے، کس طرح چھپا سکتے تھے، مگر زبانی تکذیب بھی ضرور تھی۔ جبھی تو ذہبی و ابن حجر باوجود توثیق مسند کی ضرورت کے ابن المذہب قطیعی کو زبان روکتے روکتے بھی غیر متقن وغیرہ لکھ گئے۔

مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ یہ اپنے ہم عصر محدثین کے پاس مسند کو عمر بھر لئے پھرے مگر کسی نے بھی توجہ نہ کی۔ آخر اپنے دونوں اگلے مقتداؤں کی طرح یہ بھی صرف ایک شاگرد ابوالقاسم ہبتہ اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح کامیاب ہو گئے اور مسند کی امانت انھیں کے سپرد کر کے ۴۴۴ھ میں دنیا سے سدھار گئے۔

ان ابوالقاسم ہبتہ اللہ صاحب کا بھی بالکل وہی ابن المذہب جیسا حال ہوا۔ ساری عمر مسند احمد کو ہر جگہ ڈھوئے ڈھوئے پھرتے رہے مگر علمائے حدیث میں سے ایک شخص نے بھی نگاہ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا۔ مجبوراً اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی ایک غیر معروف شخص حنبل بن عبداللہ الرصافی کو اشاعت مسند کی خدمت کسی طرح تفویض کر گئے۔ چنانچہ حنبل بن عبداللہ الرصافی کے سوا اور کوئی شیخ ابوالقاسم ہبتہ اللہ یا کسی سے بھی مسند کا راوی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ہو بھی، تو اس سے مسند کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی، جس طرح حنبل بن عبداللہ الرصافی کے بعد والے راویوں کی تعداد بڑھ جانے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر ابتک رصافی کے سوا ہبتہ اللہ سے کوئی اور مسند کا روایت کرنے والا کہیں نظر سے نہیں گزرا

مشتبہ آحاد روایتیں کبھی قابل قبول نہیں ہوتیں

محدثین کا متفقہ اصول ہے کہ کوئی ایسی روایت جس کے متعلق عقل اس کی مقتضی ہو کہ کسی خاص عہد یا ہر عہد میں اس کے جاننے والے اور اس کی روایت کرنے والے بہت کافی لوگ ہوں۔ ایسی حدیث کو اگر اس خاص عہد یا ان سب عہدوں میں صرف ایک یا ایک ایک ہی راوی ایک دوسرے سے روایت کرتے چلے آئے ہوں، تو وہ حدیث صرف آحاد ہونے کی وجہ سے ظنی ہی نہیں کہی جائے گی، بلکہ موضوع یا مشتبہ ہونے کی حیثیت سے رد کر دی جائے گی۔

حدیث آحاد ظنی اور آحاد مشتبہ اور دونوں کا فرق

عہد صحابہؓ یا عہد تابعین یا عہد تبع تابعین میں کسی حدیث کو صرف ایک ہی شخص اگر روایت کر رہا ہو تو وہ حدیث آحاد ہے۔ اگر تینوں زمانوں میں صرف ایک ہی ایک شخص روایت کرتا ہو، یا دو زمانوں میں، تو دوہرے یا تہرے آحاد ہونے کی وجہ سے اس کی ظنیت زیادہ قوی ہو کر اشتباہ سے قریب یا قریب تر ہو گی۔

مگر ایسی حدیث جس میں ایسی بات بیان کی جا رہی ہو جس کے متعلق عقل اس کا یقین رکھے کہ اس حدیث کے جاننے والوں اور روایت کرنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ ضرور ہونی چاہئے مثلاً ۱؎ وہ واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، ایک مجمع یا جماعت کے سامنے کا ۲؎ امر یا نہی ہونے کی وجہ سے اس کا حکم پوری یا کسی خاص جماعت پر عائد ہو رہا ہو اس لئے اس پر اس جماعت کا عمل درآمد ضرور ہونا چاہئے۔ ۳؎ کہا گیا ہو کہ اس کی اطلاع سب کو یا کسی خاص جماعت کو دے دو۔ ۴؎ کسی خاص جماعت یا عامۂ مسلمین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ ۵؎ کسی خاص قبیلے یا جماعت کی تعریف میں وہ حدیث وارد ہوئی ہو۔ ۶؎ وہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی ہو، تعجب خیزی کی وجہ سے مثلاً معجزہ وغیرہ یا کسی اور اعتبار سے۔ ۷؎ جو واقعہ مروی ہو وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہو، وغیرہ ذٰلک۔

اس قسم کی روایت کا صرف کسی ایک ہی صحابیؓ سے مروی ہونا ضرور شبہے میں ڈالتا ہے کہ آخر دوسرے صحابہؓ اس کے متعلق خاموش کیوں رہے اور تابعین نے اس کے متعلق کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہیں دریافت کیا؟ اگر اسی ایک صحابی سے متعدد تابعی اور ہر تابعی سے متعدد تبع تابعین بھی روایت کرتے ہوں، جب بھی صرف ایک ہی صحابی سے اس کا مروی ہونا محلِ اشتباہ ضرور ہے۔ اسی طرح متعدد صحابہؓ سے صرف ایک ہی تابعی اگر روایت کر رہے ہوں، جب بھی وہ اشتباہ سے خالی نہیں علیٰ ہذا القیاس اگر صحابہؓ و تابعی سب کا تعدد ہو مگر سب سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کر رہا ہو۔

اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے کئی تبع تابعین روایت کر رہے ہوں، تو یقیناً اشتباہ دُہرے ہونے کی وجہ سے مؤکد ہو جائے گا۔ اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کرے، جب تو تہرے اشتباہ کی وجہ سے وہ روایت بہت زیادہ مشتبہ تر ہو جائے گی۔ اور ان تمام صورتوں میں اس قسم کی روایتیں اپنے مراتب اشتباہ کے مطابق مشتبہ ہوں گی۔ اور ان میں سے کوئی روایت بھی کسی بات میں بھی حجت و سند نہیں سمجھی جائے گی اور ضرور واجب الرد ہو گی، اس لئے کہ ہم کو قرآن مجید میں اتباع ظن اور اتباع ماتشابہ سے منع کیا گیا ہے اور یہ شان کفار و مشرکین اور گمراہوں کی بتائی گئی ہیں، اسی لئے حدیث میں حکم ہے کہ "وَاِیَّاکُمْ وَالْمُشْتَبِهَاتِ" یعنی مشتبہ باتوں سے سخت احتیاط کرو۔

تو جب وہ ایک روایت جو اس طرح کی آحاد ہو، وہ مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کا یہ حال ہے تو پورا ذخیرہ جس میں تقریباً ساٹھ ہزار روایتوں کا انبار لگا ہوا ہے، یہ سارا دفتر مجموعہ کتابی صورت میں مجتمع ایسی بھیانک اور غیر معمولی احادیث سے پہنچا ہے، جس کی احادیث کا سلسلہ تین سو برس تک متفرد و مشتبہ راویوں کی پانچ چھ روایتی پشتوں تک یکے بعد دیگرے بلاشرکتِ دیگرے و بے مداخلت غیرے چلا آ رہا ہے اور تقریباً تین سو برس کے بعد کہیں جو وہ آحادیت ٹوٹتی ہے اور تعدد شروع ہوتا ہے۔ تو اس دور تعدد کا ہر راوی اس غیر معمولی آحادیت کو تسلیم کئے ہوئے اور اس پر پوری طرح قائم ہی رہتا ہے۔ کوئی بھی اس غیر معمولی آحادیت کے پہاڑ سے ٹکراتے رہنے کے باوجود اس کے شیشۂ استناد پر معمولی سے معمولی اور خفیف سے خفیف بال پڑنے کا گمان بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امام احمد کے صرف نام کی اسی قسم کی نادر ساحرانہ برکت ہے، جیسی کہ سامری کو قبضۃ من اثر الرسول سے حاصل ہوئی تھی۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

مطبوعات طلوع اسلام

ڈیرہ اسمٰعیل خاں

میں

راجہ برادرز

نیوز ایجنٹ و بک سیلرز

سے مل سکتی ہیں

۱؎ مثلاً صرف عورتوں یا صرف مردوں یا صرف جوانوں یا صرف بوڑھوں یا صرف مسافروں پر

حقائق و عبر

حکم حاکم

حکومت پاکستان نے جب روپیہ کی شرح مبادلہ کو بدلا ہے تو اس کے دوسرے ہی دن اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ حکم نامہ شائع ہوا کہ اس تبدیلی سے موجودہ اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس حکم کو پڑھ کر اطمینان ہوا کہ سردست انہی داموں پر چیزیں ملتی جائیں گی۔ لیکن اخبار کے اسی صفحے پر نیچے یہ خبر بھی درج تھی کہ کراچی کے کتب فروشوں اور ناشرین کتب نے ایک میٹنگ کی اور اس میں یہ فیصلہ کیا کہ بیرونی کتابوں اور رسائل وغیرہ کی قیمت میں پچاس فیصدی اضافہ کردیا جائے۔ حکومت کے حکمنامے کے متعلق تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ لیکن، ان کے اس فیصلہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی شام کتابیں اور رسائل ڈیوڑھی قیمت پر بکنے لگ گئے۔

ہمارا مشورہ ہے کہ حکومت آئندہ اپنے فیصلوں کو دوکانداروں کی معرفت نافذ کیا کرے۔ کیونکہ دوکانداروں کا فیصلہ تو اسی وقت مؤثر ہو جاتا ہے اور حکومت کا فیصلہ محض اخباروں کی جلی سرخیاں بن کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب ہمارے روپیہ کی شرح تبادلہ لوز روپیہ فی پونڈ ہوئی تھی تو اس زمانہ میں کراچی کے کتب فروشوں نے اپنی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی تھی، اس کے لئے وہ دلیل یہ دیا کرتے تھے کہ ہماری یہ کتابیں مہنگے داموں کی منگوائی ہوئی ہیں۔ اس لئے یہ تو انہی داموں پر فروخت ہوں گی۔ لیکن جب جدید شرح مبادلہ کے مطابق سستے داموں کی کتابیں آئیں گی تو انھیں سستی قیمت پر فروخت کیا جائے گا۔ اس وقت ان کا یہ فیصلہ نافذ العمل ہوا؛ اور اب جب شرح مبادلہ بڑھ گئی، تو انھوں نے اپنے موجودہ اسٹاک کی قیمتیں بھی ساتھ ہی بڑھا دیں۔

یہ بات کچھ کتابوں تک ہی محدود نہیں۔ تمام چیزوں کی قیمتوں کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

بے حیائی کی حد بندی

ہمارے معاشرہ میں بےحیائی اور فحش کاری کو عام کرنے میں سب سے زیادہ حصہ سنیما کا ہے۔ ایک ایک شہر میں درجنوں سنیما گھر، ایک ایک سنیما گھر میں تین تین چار چار شو روزانہ ہر شو میں ہزار ہزار ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار تماشائی ہیں۔ ان میں بچے جوان، بوڑھے۔ لڑکیاں، عورتیں سب شامل ہیں اور ان کے سامنے بے حیائی کے ایسے مناظر اور جذبات انگیزی کے ایسے گیت جن کا آج سے بیس پچیس برس ادھر کوئی شریف انسان تصور تک بھی نہیں کر سکتا تھا، پھر ان گیتوں کے ریکارڈ جو گراموفون باجوں پر اور ریڈیو کے ذریعہ شریف گھروں کی خلوتوں کے اندر تک جا گھستے ہیں۔ خیال تھا کہ شاید ارباب حکومت میں سے کبھی کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ مجھ سے کوئی اور نیک کام تو بن نہیں پڑا کم از کم میں اس بے حیائی کے سرچشمے ہی کو روک دوں۔ آج تک ہماری یہ توقع عبث ثابت ہوئی۔ لیکن معلوم ہوا کہ نہیں ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں اس کا احساس ہے۔ کراچی کی اطلاع ہے کہ اگلے دنوں کچھ لوگوں کا ایک ڈیپوٹیشن چیف کمشنر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان کی خدمت میں گذارش کی کہ جب ہندوستانی فلموں میں بوس بازی کی ممانعت ہے تو انگریزی فلموں میں سے وہ حصے کیوں نہیں کاٹ دیئے جاتے جن میں اس قسم کے عریاں سین آتے ہیں انھوں نے اس تجویز کو غور سے سنا اور اس سے اتفاق کیا کہ بے حیائی کی ان باتوں کی فی الواقع روک تھام ہونی چاہیئے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اس وقت انگریزی فلموں میں منہ چومنے کا سین تیس سکنڈ تک دکھایا جاتا ہے میں حکم دوں گا کہ یہ وقفہ زیادہ سے زیادہ دس سکنڈ تک محدود کر دیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس فیصلہ کا یورپ اور امریکہ میں عام اعلان ہونا چاہیئے۔ تاکہ ان مادہ پرستوں کو معلوم ہو جائے کہ لادینی حکومتوں اور ایک اسلامی مملکت میں کیا فرق ہوتا ہے اتنا ہی فرق جتنا تیس سکنڈ اور دس سکنڈ کی بے حیائی میں ہوتا ہے۔

ناخوشگوار فریضہ

ہمیں دھران (سعودیہ عربیہ) سے بعض قارئین طلوع اسلام کی طرف سے ایک مراسلہ موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہم نے یہاں سنا ہے کہ آجکل جماعت اسلامی کے مولانا مودودی اور مجلس احرار کے علمائے کرام میں باہمی تھوکا فضیحتی ہو رہی ہے۔ دھران میں ایسے اخبارات نہیں ملتے جن میں ان چیزوں کی تفصیل درج ہو اور طلوع اسلام میں بھی ان کے متعلق کچھ لکھا ہوا نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ ہم لوگ ان دلچسپ چیزوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ہے کہ طلوع اسلام پوری تفصیل سے لکھے کہ یہ جھگڑا کیا ہے اور فریقین کی چپقلش کی نوعیت کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ پردیس میں ہر شخص کو اپنے دیس کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی معلوم کرنے کا شوق ہوتا ہے اور وطن کی ہر بات دلچسپی سے سنی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے ان دور افتادہ بھائیوں کا تقاضہ قابل فہم ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس ارشاد کی تعمیل سے قاصر ہیں۔ اس لئے کہ جبہ و دستار کی چپقلش کی مقدس داستانوں میں وہ سب کچھ بھی آ جاتا ہے۔ جس کے متحمل طلوع اسلام کے صفحات نہیں ہو سکتے۔ پھر ان کا سلسلہ اتنا لامتناہی ہوتا ہے کہ

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

اور طلوع اسلام کے محدود سے دامن میں اتنی گنجائش کہاں؟

بہرحال ان حضرات کے تقاضۂ ذوق کے پیش نظر مختصر الفاظ میں اتنا بتا دینا شاید کافی ہوگا کہ ان حضرات کی باہمی آویزش کی بنیاد تحریک ختم نبوت کے زمانے کے اندرون خانہ کے کچھ واقعات ہیں۔ ان کے متعلق سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ مودودی صاحب کے خلاف غلط بیانی سے کام لیں تو انھیں رسول اللہ کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ان الزامات کی تردید بھی یہ کہہ کر فرمائی کہ اگر میں غلط کہتا ہوں تو مجھے بھی اپنے نانا کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اس سے آگے بات چلی تو مجلس احرار کے دیگر سربرآوردہ حضرات نے مودودی صاحب کے خلاف الزامات کی ایک فہرست شائع کردی۔ اس وقت ایک مقدمہ مولانا احمد علی صاحب (شیرانوالا گیٹ لاہور) اور مرتضیٰ احمد خاں صاحب میکش (مدیر نوائے پاکستان) کے خلاف جماعت اسلامی کی طرف سے لاہور کی عدالت میں دائر ہے اور ایک مقدمہ میکش صاحب کی طرف سے مودودی صاحب کے خلاف دائر ہے۔ جو مقدمہ جماعت اسلامی کی طرف سے دائر ہوا ہے اس کے عرضی دعویٰ میں انھوں نے منجملہ دیگر امور یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے خلاف پروپیگنڈہ اُس وقت کیا گیا ہے جب کہ بقرعید قریب آ رہی ہے۔ اور اس سے منشا یہ ہے کہ ہمیں قربانی کی کھالیں نہ ملیں۔ اور اب عید کے بعد ان کی طرف سے یہ پرمسرت اور قابل فخر اعلانات ہو رہے ہیں کہ ہمیں اللہ کے فضل و کرم سے اس مرتبہ اتنی کھالیں ملی ہیں جتنی اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھیں۔

خدا گر بہ حکمت ببندد درے
کشاید ز فضل و کرم دیگرے

ذاتی ملکیت

کا اصول

ملّا کے نزدیک بڑا مقدس ہے

لیکن

اس بارے میں قرآن کا حکم کیا ہے

اس کی تفصیل

"نظام ربوبیت"

میں دیکھئے

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز ۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش ۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں ۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات ۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ ۔ مضبوط و حسین جلد بمعہ گرد پوش ــــــــ قیمت ۔ بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز ۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے ۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم ۔ ابلیس ۔ جنات ۔ ملائکہ ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل ۔ بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات ــــــــ قیمت ــــ آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے ۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے ۔ دو سو چوبیس صفحات ــــــــ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں ۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے ؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات ۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں ۔
۱۸۰ صفحات ــــــــ قیمت ــــ دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز ۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کا شگفتہ ، مدلل اور اچھوتا جواب ۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ــــــــ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۔
۴۰۰ صفحات　قیمت ــــ چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز ۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا ؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ــــــــ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو ۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر ۔ سات سالہ دورِ آزادی کی مٹتی ہوئی تاریخ ۔ ۲۵۶ صفحات ــــــــ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاجِ شناسِ رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی ؟ مزاج شناس رسول ! مزاج شناس کون ہیں ؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی ۔ ۴۴۰ صفحات ۔ قیمت ــــــــ چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب ۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی ۔ دو جلدیں ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد ــــــــ چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز ۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۔ ۴۱۲ صفحات ــــ قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ ۔ چار سو صفحات ــــــــ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز ۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات ۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں ۔
صفحات ۱۹۲ ــــــــ قیمت دو روپے

نظامِ ربوبیت — از پرویز ۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب ۔ ضخامت تین سو صفحے ۔
قیمت قسم اول ــــ چھ روپے　قسم دوم ــــ (غیر مجلد) ــــ چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز ۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ ۔ صفحات ۲۵۶　قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ :۔ ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ، کراچی

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام کی شرائطِ ایجنسی

شرح کمیشن

معراجِ انسانیت ــــ ۲۵ فی صدی ۔ دیگر مطبوعات ۳۳ فی صدی
(۲) قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائیگی ۔ (۳) غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی ۔ (۴) پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم کی نہیں ہونی چاہیئے ۔ (۵) ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے ۔ ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی ۔
نوٹ :۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملہ طے کریں ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ، کراچی

طلوع اسلام کثیر تعداد میں شائع ہو کر پاکستان و ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقہ کے لوگوں کے پاس جاتا ہے ۔ اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گذرتے ہیں ۔
نرخنامہ اشتہارات ، و تفصیلات ناظم ادارہ (شعبۂ اشتہارات) سے حاصل کیجئے ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ، کراچی

ماہنامہ طلوع اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

۱۹۴۹ء	اگست ، ستمبر ، نومبر ، دسمبر
۱۹۵۱ء	مئی تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزمہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیئے جائیں گے ۔
خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں ۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ــ کراچی

نقد و نظر

۱۔ نماز از روئے قرآن

آج سے کچھ عرصہ پہلے پنجاب میں رجعت الی القرآن کی ایک تحریک جاری ہوئی تھی جسکے بانی چکڑالہ ضلع میانوالی کے مولنا عبداللہ صاحب تھے۔ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں قرآن کی عظمت اور خالص خدا کی اطاعت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ اسکی شدت سے مضطرب و بیتاب رہتے تھے۔ ان کی ساری عمر قرآن کی نشر و اشاعت میں گزری۔ لیکن ان کے سامنے قرآنی نظام کا تصور نہ تھا۔ ان کی نگاہ قرآن کے خصہ پر تھی یعنی مسلمانوں کی روز مرہ کی انفرادی زندگی کے متعلق قرآنی احکام پر۔ اس باب میں انہیں ایک بنیادی غلطی لگی۔ جس کی وجہ سے ان کی عمر بھر کی کاوش کوئی تعمیری نتائج مرتب نہ کر سکی۔ وہ غلطی یہ تھی کہ انھوں نے سمجھا کہ زندگی سے متعلق تمام احکام کی جزئیات تک بھی قرآن نے متعین کر دی ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے تمام قوانین کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ اس لئے انھیں تمام جزئیات کو قرآن سے نکالنے کے لئے بڑی دور از کار تاویلات سے کام لینا پڑا۔ اسی ضمن میں انھوں نے نماز کی جزئیات کو بھی اپنی دانست میں قرآن سے مرتب کرنے کی کوشش کی اور اس طرح نماز کی ایک ایسی شکل تجویز کی جو ہماری مروجہ شکل سے بعض باتوں میں مختلف تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی تحریک ایک فرقہ بنکر رہ گئی۔

ہمارے پیش نظر ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے جسے غلام احمد قریشی صاحب وثیقہ نویس کچہری ضلع پشاور نے شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے نماز کی جزئیات کو قرآن سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً یہی وہ جزئیات ہیں جنھیں مولانا عبداللہ صاحب نے مرتب فرمایا تھا۔ یہ جزئیات کس طرح سے مرتب کی گئی ہیں اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ سورۃ قصص میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ سے فرمایا کہ واضمم الیک جناحک من الرھب (۲۸/۳۲) اس سے مولف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے چاہئیں اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس انداز سے مرتب کی ہوئی جزئیات کو کس حد تک قرآنی کہا جائے گا۔ ایسی کوشش کا فائدہ تو کچھ ہے نہیں لیکن یہ چیز ملت میں مزید انتشار اور فرقہ بندی کا موجب بن جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ "دعوت الی القرآن" کی ایسی مبارک آواز یوں ناکام ہو کر رہ گئی۔

ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق دین کی صحیح صورت یہ ہے کہ قرآن کریم نے بالعموم اصولی قوانین دئیے ہیں ان اصولوں کی عملی شکلیں سب سے پہلے نبی اکرم ؐ نے متعین فرمائیں۔ رسول اللہ ؐ کے بعد اگر حضورؐ کی اتباع میں قائم کیا ہوا اسلامی نظام یہ دیکھے کہ کس وقت زمانے تقاضے ان جزئیات میں رد و بدل چاہتے ہیں تو منشائے قرآنی کے مطابق ان میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ اور اگر رد و بدل کی ضرورت نہ ہو تو وہ علی حالہٖ قائم رہتے ہیں۔ کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کر کے امت میں خواہ مخواہ انتشار پیدا کرے۔ البتہ ان میں اگر کوئی ایسی چیز معلوم ہو جو صریحاً قرآن کے خلاف جاتی ہو تو اس کے متعلق یہ کہکر آواز بلند کی جا سکتی ہے کہ اسے رسول اللہ کی طرف غلطی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہیں جا سکتا۔

بوذر غفاری کا مذہب

شائع کردہ سید احمد علی معتمد بزم ادب شہداد پور (سندھ)، ٹائپ کا چھاپہ۔ چھوٹا سائز ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنہ بلا جلد۔ اس کتابچہ میں رسول اللہ کے صحابی حضرت بوذر غفاری رضؓ کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں۔ طلوع اسلام کے صفحات پر حضرت بوذر غفاری رضؓ اور ان کی دعوت کا ذکر متعدد بار آچکا ہے۔ اگرچہ آپ کی دعوت کی تفاصیل نہیں ملتیں لیکن جو مختصر سی کڑیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی ملتی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ قرآن کے نظام ربوبیت کے داعی تھے جس کی رو سے زر اندوزی جائز نہیں قرار پاتی یہ امر موجب مسرت ہے کہ اب مسلمانوں کا رجحان اس نظام کو سمجھنے کی طرف ہو رہا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی رجحان کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ہمیں داعیٔ "بوذری جماعت" کی طرف سے تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہے۔

ان جذبات کے احترام کے باوصف جو اس قسم کے لٹریچر کی اشاعت کا موجب ہوتے ہیں ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کتاب کا انداز محققانہ اور داعیانہ کے بجائے کچھ افسانوی سا ہو گیا ہے جو نہ تو حضرت بوذر غفاری رضؓ کے شایان شان ہے نہ ان کی دعوت کے مناسب۔ نیز اس میں اس احترام کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا جو دور صحابہؓ میں باہمی اختلافات کے بیان کے وقت ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہ مقامات بڑی احتیاط کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہمیں تاریخ میں کوئی بات قرآن کے خلاف نظر آئے تو ہمیں اس کا اظہار بیباکانہ کر دینا چاہئے لیکن بیباکی کا ڈنڈا گستاخی سے نہ جا ملنا چاہئے۔ بشوقاً یہ بھی عرض ہے کہ کتاب کا نام "بوذر غفاری کا مذہب" کی بجائے "حضرت بوذر غفاری رضؓ کا مسلک" یا "آپ کی دعوت" ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ نیز اس جماعت کا نام بوذری کی بجائے کچھ اور ہوتا؟؟ تو بہتر تھا۔ کتاب میں طباعت کی اغلاط بکثرت ہیں جس کے لئے پریس کے منیجر نے معذرت پیش کی ہے۔

باب المراسلات

حدیث کے متعلق ایک وضاحت

لائلپور سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ وہاں کے مقامی اخبار المنیر کی حالیہ اشاعت میں جماعت اسلامی کے سابق امیر مولنا عبدالغفار حسن صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جسمیں انھوں نے حدیث اور سنت کے متعلق طلوع اسلام کے موقف کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں بعض مقامات پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دانستہ الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایک بات ایسی ہے جسکی وضاحت کی ضرورت ہے وہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات طلوع اسلام یہ کہتا ہے کہ حدیث کو پرکھنے کا معیار قرآن ہے اور بعض اوقات یہ کہتا ہے کہ حدیث کی صحت کے متعلق قرآن سے بھی پتہ نہیں چل سکتا۔ آپ براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

طلوع اسلام

جس مضمون کا آپ نے حوالہ دیا ہے اسکے متعلق ہم مدیر المنیر کی خدمت میں الگ خط لکھ رہے ہیں۔ جہاں تک اس نقطہ کا تعلق ہے جسے آپ نے لکھا ہے یہ بالکل صاف ہے۔ احادیث کے مجموعوں میں دو قسم کی حدیثیں ملتی ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق حضورؐ کی ذاتی سیرت سے ہے اور دوسری وہ ہیں جو قانونی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً۔

(۱)۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم ؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ اس حدیث کی حیثیت قانونی نہیں بلکہ اس کا تعلق حضورؐ کی سیرت سے ہے۔ اسکی صحت و سقم جانچنے کے لئے قرآن کریم معیار ہے۔ اسلئے کہ قرآن کریم شہادت دیتا ہے کہ ایک رسول جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ اس لئے ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث کبھی رسول اللہ ؐ کی نہیں ہو سکتی۔

(۲)۔ قرآن کریم میں زکوٰۃ کا اصولی حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ؐ نے اس کی شرح اڑھائی فیصدی مقرر فرمائی۔ یہ پرکھنے کیلئے کہ حضورؐ نے واقعی اڑھائی فیصدی شرح مقرر فرمائی تھی یا کچھ اور قرآن کریم معیار نہیں بن سکتا اسلئے کہ قرآن کریم میں اسکی شرح کا ذکر نہیں ہے یعنی جسطرح قرآن کریم کی روشنی میں بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ نے کبھی یہ نہیں کہا ہوگا کہ حضرت ابراہیم ؑ نے جھوٹ بولا تھا، اسی طرح ہم قرآن کی روشنی میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ حضورؐ نے زکوٰۃ کی شرح کیا مقرر فرمائی تھی۔ لہٰذا قرآن کے جن اصولی احکام کی جزئیات رسول اللہ ؐ نے متعین فرمائی تھیں ان کی صحت و سقم کو قرآن کی رو سے نہیں پرکھا جا سکتا۔

امید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ طلوع اسلام نے جب کہا ہے کہ ایک قسم کی احادیث کو پرکھنے کا معیار قرآن ہو سکتا ہے اور دوسری قسم کی احادیث کی صحت و سقم قرآن سے بھی پرکھی نہیں جا سکتی۔ تو اس سے اس کا مطلب کیا ہے

یہ دوسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ اسبات کا فیصلہ امت کا وہ نظام کریگا کہ جو علیٰ منہاج نبوت قرآنی قوانین کو نافذ کرنے کے لئے

عالم اسلامی

مراکش کی صورت حال میں اصلاح کی جو توقعات پیدا ہوگئی تھیں وہ ختم ہوتی نظر آتی ہیں اور خونی ہنگاموں کے پھر سے بڑھ جانے کے آثار پیدا ہوگئے ہیں۔ ہنگاموں کا موجودہ دور خصوصیت سے ۱۴ر جولائی سے شروع ہے۔ یہ دن فرانس میں "بسٹیل ڈے" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تقریب پر فرانسیسی آبادکاروں نے قانون اپنے ہاتھ میں لیکر اہل مراکش کے خلاف بلوؤں کی طرح ڈالی اور ان پر ابھی تک قابو نہیں پایا جا سکا۔ اس سے بڑی نازک صورت حال پیدا ہوگئی اور فرانس کے حکومتی حلقوں میں اسے گہری تشویش سے دیکھا گیا۔ ریذیڈنٹ جنرل گرینڈ ول نے بجا طور پر ان ہنگاموں کے لئے سیاسی حالات کو ذمہ دار قرار دیا اور اس کا علاج یہ سوچا کہ مراکش کو مناسب اصلاحات دی جائیں۔ اصلاحات کے سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ فرانس نے دو سال پیشتر سلطان محمد بن یوسف کو بدیں وجہ معزول کر دیا تھا کہ وہ وطن پرستوں کے مؤید ہیں۔ ان کی بجائے ان کے ایک حریف کو سلطان بنا دیا گیا تھا کیونکہ وہ فرانس کے نزدیک زیادہ قابل قبول تھا۔ چنانچہ مراکشی اس دن سے مسلسل ابن یوسف کی بحالی کا مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں یہاں تک کہ اب یہ مطالبہ .... آزادی کے مطالبہ کا لازمی جزو بن گیا ہے۔ فرانس وطن پرست سلطان کو بحال کرنے کے لئے تیار نہیں لیکن اہل مراکش کا اشتداد دیکھ کر گرینڈ ول نے یہ تجویز پیش کی کہ نہ معزول سلطان کو واپس لایا جائے نہ موجودہ سلطان کو بحال رکھا جائے۔ اس کے بجائے ایک ریجنسی کونسل قائم کر دی جائے اور اصلاحات کا نفاذ اس کی وساطت سے کرایا جائے۔ فرانس کا متشدد طبقہ اس بین بین تجویز کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ ریذیڈنٹ جنرل کے منصوبہ اصلاحات کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ مراکش میں اس تجویز کو پسند نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ اس کے لئے ضرور تیار ہو گیا تھا کہ اگر اصلاحات وقیع ہوں تو انھیں آزما لیا جائے۔ لیکن فرانسیسی مخالفت نے انھیں مایوس سا کر دیا ہے۔

گرینڈ ول کے مقابلے میں فرانسیسی وزیر اعظم مسٹر فارے نے اپنی طرف سے اصلاحات کے بنیادی اصول پیش کئے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ (۱) مراکش میں فرانسیسی مفاد کا ہر نوع تحفظ کیا جائے۔ (۲) مراکش کو بتدریج انتظامی معاملات میں دخیل کیا جائے۔ (۳) ان جدید اداروں کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کی جائے جن کا مراکش کی طرف سے مطالبہ ہو رہا ہے۔ اور (۴) مراکش۔فرانسیسی برادری بنائی جائے۔ یہ اصول بیان کر کے مسٹر فارے نے اہل مراکش کو بدظن کر دیا ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ اصول مبہم ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عملاً مراکش کو کیا اصلاحات دی جائیں گی۔ دوسرے معزول سلطان کی بحالی کا مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے اور اہل مراکش اس پر شدت سے اڑے ہوئے ہیں۔ اس اعلان کا فوری ردعمل کاروبار کے تعطل کی صورت میں ظاہر ہوا اور گو ابھی تک اس کی وجہ سے ہنگامہ کوئی نہیں ہوا لیکن اس نے صورت حال مخدوش کر دی ہے۔

۲۰ر اگست کو مراکش میں سلطان ابن یوسف کی معزولی کی دوسری سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ پہلے خیال تھا کہ یہ دن امن و امان سے گزر جائیگا لیکن اب یہ خدشہ قوی ہوگیا ہے کہ اس دن پھر سے فسادات رونما ہو جائیں گے۔ فرانس کے وزیر اعظم اور مراکش میں فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل اس نزاکت کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں کہ مراکش کے مسئلے کا حل فوری اور وسیع سیاسی اصلاحات میں ہے لیکن ان کی ملکی سیاست انھیں کوئی اطمینان بخش قدم اٹھانے نہیں دیتی۔ اگر فرانسیسی حکومت نے یہ موقع ضائع کر دیا تو مراکش میں قتال و جدال کا ایک نیا بازار گرم ہو جائیگا اور خود فرانسیسی حکومت برقرار نہیں رہ سکیگی۔

سوڈان کے وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے کہ انتظامی مشینری کو سوڈانی بنانے کا مرحلہ مکمل ہوگیا ہے۔ چنانچہ اب اگلا اور آخری مرحلہ شروع ہوگا۔ معاہدہ کے مطابق اب ایک مجلس دستور ساز مرتب کی جائے گی جو یہ فیصلہ کرے گی کہ سوڈان مصر سے الحاق کریگا یا آزاد ہوگا۔ سوڈان کی موجودہ پارلیمان ۲۰ر اگست کو ایک قرارداد پاس کر کے مجوزہ مجلس دستور ساز کے لئے انتخابات کا سلسلہ شروع کر دے گی۔ یہ انتخابات ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں طے پائیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ تجویز ہوئی ہے کہ مصر اور برطانیہ دونوں اس کمیشن میں شریک نہ ہوں تاکہ انتخابات پر وہ کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکیں۔ مصر سے آمدہ بعض اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی طرف سے روس اور یوکرائن کو نامزد کیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے لیکن اگر ایسا ہو گیا تو اشتراکی اثر بہت دور تک پھیل جائیگا۔ بدقسمتی سے مصر نے ان دنوں خصوصیت سے ماسکو کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ۲۳ر جولائی کو مصر کے فوجی انقلاب کی تقریب سالگرہ منائی گئی تو اس میں ماسکو کے پراودا اخبار کا ایڈیٹر بھی مدعو کیا گیا تھا اور اب یہ اعلان ہوا ہے کہ کرنل ناصر آئندہ سال موسم بہار میں روس جا رہے ہیں۔ یہ آثار یقیناً خوش آئند نہیں۔ ان دعوتوں اور آمد و رفت سے مشرق وسطیٰ کا دروازہ اشتراکیت کے لئے چوپٹ کھل جائے گا اور جب اس کے نتائج کا وقت آئیگا اس وقت ان کو بھی کف افسوس ملنا پڑیگا جو اس وقت سادگی سے یہ دروازہ کھولنے میں لگے ہوئے ہیں۔

بین الاقوامی جائزہ

عالمی سیاست بدستور جنیوا کی چوٹی کانفرنس سے مسحور ہے جگہ بہ جگہ مفاہمت و مصالحت کی گفتگوئیں ہو رہی ہیں اور بین الاقوامی رواداری اور تعاون کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ جنیوا کانفرنس کے خاتمہ پر امریکہ اور چین کے مابین براہ راست مذاکرات شروع ہو جانے سے مصالحت پسندی کی فضا مشرق بعید تک پہنچ گئی ہے۔ یہ مذاکرات جنیوا میں یکم اگست کو شروع ہوئے تھے۔ اور ابھی تک جاری ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چین نے اس سلسلہ میں مشرق بعید سے ایک عمومی معاہدہ کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ تصور جنیوا کے مذاکرات میں پیش نہیں کیا گیا بلکہ علیحدہ طور پر یہ شوشہ چھوڑا گیا ہے۔ اس سے ایک حد تک یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرخ چین کے پیش نظر کیا کچھ ہے۔ روس نے یورپ میں بھی ایسے معاہدے کی پیشکش کر رکھی ہے۔ لیکن اقوام مغرب نے اس سلسلہ میں کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی۔ مشرق بعید میں بھی ان کی روش کم و بیش یہی رہے گی۔ فی الحال اس معاہدے کی توقع نہ یورپ میں کی جا سکتی ہے نہ ایشیا میں لیکن مذاکرات کا جو سلسلہ شروع ہو گیا ہے اس سے اچھے نتائج ضرور برآمد ہو سکتے ہیں۔

امریکہ اور چین کے مابین براہ راست مذاکرات شروع ہوئے تھے۔ تو ان کا نقطہ ماسکہ دونوں ممالک کے ان شہریوں کی واپسی تھا جو بوجوہ قید میں ہیں۔ چین نے اس سلسلہ میں قابل ذکر اقدام کیا ہے اور ان گیارہ ہوا بازوں کو رہا کر دیا ہے جن کے لئے اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل نے چین کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس رہائی سے استنباط کیا گیا کہ چین کے نزدیک گفتگو کا محور قیدیوں کی رہائی اتنا نہیں جتنا دیگر امور ہیں۔ یوں تو ان دیگر امور سے متعلق اعلان موجود ہے کہ وہ زیر بحث آئیں گے لیکن اب مذاکرات کا رخ ان کی طرف زیادہ ہو گیا ہے۔ ان میں قابل ذکر مسئلہ فارموسا کا ہے جس پر کچھ عرصہ پیشتر جنگ تک کی باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے لئے متعدد قوموں کی مشترکہ کانفرنس کی تجویز بھی پیش ہوئی اور چین اور امریکہ کے مابین براہ راست گفتگو بھی۔ لیکن نیشنلسٹ چین کی شرکت یا عدم شرکت پر بات بگڑ جاتی رہی۔ امریکہ کو اصرار تھا کہ فارموسا کے نمائندوں کو ضرور شریک گفتگو کیا جائے اور چین انھیں نظر انداز کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اب جب کہ دونوں ممالک کے نمائندے باہم مل بیٹھے ہیں تو یہ ممکن ہے کہ یہ مسئلہ زیر بحث آ جائے۔

چین نے مفاہمت پسندی کا جو مظاہرہ کیا ہے اس سے یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ امریکہ جلد اس کی اشتراکی حکومت کو تسلیم کرلے گا۔ اس خوش فہمی کی گنجائش ضرور پائی جاتی ہے لیکن ہنوز یہ منظوری قبل از وقت ہے چنانچہ صدر آئزن ہاور نے یہ صاف کہہ دیا ہے کہ ان کا ارادہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چین اسے اپنی مطلب براری کا ذریعہ نہیں بنائے گا۔ وہ امریکہ کو پوری طرح یقین دلانے کی کوشش کریگا کہ اس کے عزائم امن پسندانہ ہیں اور وہ اقوام متحدہ کے مقصد و مسلک کو قبول بھی کرتا ہے اور اس پر قائم بھی رہے گا۔ چین انہی طریقوں سے اقوام متحدہ تک پہنچ سکتا ہے امریکہ بہرحال یہ قیمت آسانی سے نہیں دے گا۔

چوٹی کی کانفرنس نے چاروں بڑے ممالک کے وزرائے خارجہ کی جس کانفرنس کا فیصلہ کیا تھا وہ ۲۷ر اکتوبر کو منعقد ہو رہی ہے۔ ان کی کانفرنس سے صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ جنیوا کانفرنس

نے جو بیج بویا ہے اس میں کونسا پھل آنے لگا۔ صدر آئزن ہاور نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک دوسرے ممالک کا ہوائی فوجی معائنہ لیا جائے یعنی ان ممالک پر اڑ کر تصویریں لی جائیں۔ اور پھر ان کے مطابق جنگی قوت کا تخمینہ لگایا جائے۔ مارشل بلگانن نے ایک دن تو اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ ناقابل عمل ہے لیکن دوسرے دن انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جنگی قوت کا اندازہ لگانے کے سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہوگا کہ آئندہ بھی ایسا معائنہ کیا جا سکے اور اس قوت کے اضافے کو روکا جا سکے۔ یہ معاملہ بڑا پیچیدہ ہے اور آج تک اس مسئلہ پر کسی قسم کا اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ لیکن اب پھر ان خطوط پر کام شروع ہو گیا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ کوئی متفقہ لائحۂ عمل تیار ہو جائے۔ روس نے ان دنوں یہ بھی اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی فوج میں چھ لاکھ چالیس ہزار کی کمی کرے گا۔ اس پر وہ دسمبر کو عمل درآمد ہو گا یوں پہل کر کے روس نے گویا اقوام مغرب کو مجبور کرنا چاہا ہے کہ وہ بھی اسی طرح کی کمی کا اعلان کریں لیکن اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ اب تک تقریباً یہ صورت ہے کہ تعداد کے اعتبار سے روس کے پاس فوج زیادہ ہے وہ اس میں کچھ کمی بھی کرے گا تو اس سے اقوام مغرب پر عددی برتری کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے برعکس اقوام مغرب اپنی فوج کی تعداد کم کریں گی تو انھیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس اعلان کا امریکہ اور برطانیہ میں اثر ضرور ہوا ہے کہ روس عالمی کشیدگی کم کرنے کے لئے عملی اقدامات کرنے کے لئے تیار ہے اس فضا میں تحدید اسلحہ کے مذاکرات زیادہ اطمینان اور دلجمعی سے طے ہو سکیں گے اور یہ اکتوبر میں ہونیوالی وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے لئے نیک فال ہے۔

خودکشی اور اسلامی دستور

(صہ ۶ سے آگے)

> خزانہ کرنے کے بجائے اسے غربا کے مصرف میں اس طرح سے دے دیا جائے گا جس سے ان کے دنیا جنت بن جائے گی

اس کے بعد وہ یہ فرماتے ہیں کہ اسلام نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

> اس موضوع پر اسلامی تعلیمات میں کچھ ابہام نہیں اہل علم جانتے ہیں کہ دین مبین میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے مرتکب کے لئے وعید وارد ہے کہ وہ عالم برزخ میں اور حشر کے بعد اسی عذاب میں مبتلا رہے گا جس میں اس نے غلطی سے ماورا بوجھ کر اپنے آپ کو مبتلا کر لیا تھا۔ زہر کھانے والا بار بار زہر کھائے گا۔ اور مر مر کر جیے گا خنجر سے کام تمام کرنے والا خنجر ہی گھونپتا رہے گا اور پھندا لگانے والا پھانسی ہی پاتا رہے گا۔ گویا جان جان آفریں کی ہے جس نے دی ہے۔ اسی کا کام ہے کہ وہ اسے واپس بھی لے دیگر فرائض کی طرح اس کی حفاظت کرنا بھی خدا اور نفس کی طرف سے ہم پر عائد ہونے والے حقوق کی طرح ایک فرض ہے۔

افسوس اس بات پر آتا ہے کہ باوجود اتنا ظاہر حکم اور فیصلہ موجود ہونے کے ہوتے اس کی تبلیغ میں مجرمانہ غفلت کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے خطیبوں اور واعظوں کے خطبوں اور وعظوں میں کتابی مسائل کے لچھے کے لچھے پھیلتے جائیں گے دور از کار قصے، کرامات اور معجزات کو شیر خوانی کی چاشنی سے ہم مزے مزے لے کر منبروں سے نشر کریں گے لیکن حالات حاضرہ پر کچھ فقرات پیدا کرنے سے ہماری گویائی عاجز اور عملی زندگی کی خرابیوں کا تصور پیدا کرنے اور ان سے عوام کو باز رکھنے کا موثر اسلوب اختراع کرنے میں ہماری تخیل سقیم ہو کر رہ گئی ہے۔

آپ نے علاج ملاحظہ فرمالیا! یعنی معاشرہ پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ایسے حالات پیدا ہی نہ ہونے دے جس سے تنگ آکر فاقہ کش، نادار، بیمار خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خودکشی ایک جرم ہے۔ لیکن جس اسلام نے ایک فاقہ کش کو اضطراری حالت میں حرام تک کھا لینے کی اجازت دی ہے کیا اس کے ہاں ایک ایسے نادار کے لئے جس کے پاس نہ پیٹ بھر کر کھانے کے لئے روٹی ہو، نہ اپنی بیماری کے علاج کے لئے پیسہ اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ اس غریب سے وعظ کہے جائیں لیکن جو اس کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں انھیں اس کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جس قدر جی چاہے دولت سمیٹتے چلے جائیں بشرطیکہ وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال کر ان فتوے دینے والوں کی مفت خوری کا انتظام کرتے رہیں!

یاد رکھیئے یہی ہے ان لوگوں کی طرف سے پیش کردہ وہ اسلام جو دنیا میں کمیونزم کے جہنم کو اس تیزی سے بڑھاتا چلا جا رہا ہے کہ اس کے شعلوں کی لپیٹ سے کوئی فضا بھی محفوظ نہیں نظر آتی۔ اگر پاکستان میں اس قسم کے ارباب شریعت کا تجویز کردہ اسلامی دستور نافذ ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ اس کے دروازے کمیونزم کے جہنم کے لئے چوپٹ کھل جائیں گے اور اس وقت (عام مسلمانوں پر تو جو بیتے گی، بیتے ہی گی) خود وہ تمام قوتیں جو آج کمیونزم کی روک تھام کے لئے اس قدر روپیہ صرف کر رہی ہیں دانتوں میں انگلی دبائے بصد حسرت و یاس کہہ رہی ہونگی کہ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (۹۰/۶)! ہم نے اتنی دولت ناحق ضائع کی!

باب المراسلات

(صفحہ ۱۶ سے آگے)

قائم ہوگا، کہ زکوٰۃ کی موجودہ شرح جس کی نسبت رسول اللہ کی طرف کی جاتی ہے علی حالہ باقی رکھی جائے یا اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس میں رد و بدل کیا جائے۔ بظاہر یہ کہ اس نظام کے سامنے سوال یہ نہیں ہوگا کہ یہ احادیث جن میں یہ شرح مقرر کی گئی ہے صحیح ہیں یا غلط۔ اس کے سامنے سوال یہ ہوگا کہ یہ شرح ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔ اگر یہ پورا کرتی ہے تو اس شرح میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں ہوگی اور اگر یہ پورا نہیں کرتی تو یہ نظام اپنے زمانوں کے تقاضوں کے مطابق اس میں ضروری تغیر و تبدل کر دے گا بشرطیکہ یہ تبدیلی قرآن کے مقرر کئے ہوئے حدود کے اندر ہو۔

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے - ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا - اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے - یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس* روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے - اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی - اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی - اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے -

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے - جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں -

★ ★ ★

نئی مجلس دستور ساز

بننے سے پھر یہ سوال پیدا ہوگیا ہے کہ پاکستان کا آئین کیا ہوگا - یہ سوال بڑا اہم ہے - لیکن اس کا جواب؟ - - - اس کے لئے دیکھئے -

قرآنی دستور پاکستان

جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کے مطابق دستور پاکستان کیا ہوسکتا ہے؟ مملکت پاکستان کے لئے اسلامی آئین مرتب کرنے کی پہلی اور منفرد کوشش - اس میں ان کوششوں کا محاکمہ بھی ہے جو دستور مرتب کرنے کے سلسلہ میں حکومت اور علماء کی طرف سے کی گئی ہیں - یہ دستور اور متعلقہ مباحث کی ایسی مکمل کتاب ہے جس کا مطالعہ آئین میں دلچسپی لینے والوں کے لئے ناگزیر ہے -

صفحات ۲۲۴　　　　قیمت دو روپے آٹھ آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۷ - کراچی ۳

مفاد خویش

پیش نظر ہو تو انسان جمع کئے جاتا ہے لیکن اس کا

پیٹ نہیں بھرتا ۔

وہ سمجھتا ہے
کہ یہی مال و دولت اسے حیات جاودانی عطا کردے گا ۔
اس کی نگاہ مفاد عاجلہ پر ہوتی ہے اور وہ

مستقبل کی خوشگواریوں

کو نظر انداز کردیتا ہے ۔
اس معاشرے میں ایک انسان دوسرے انسان سے الگ ہوجاتا ہے
اور ہر شخص اپنے مفاد کے حصول میں ایسا جذب ہوتا ہے کہ

اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی ۔

اس کا نتیجہ وہ

تباہیاں

ہیں جو اس وقت دنیا بھر کو گھیرے ہوئے ہیں ۔ قرآن ان
تباہیوں سے بچنے کا ذریعہ بتاتا ہے ۔ کیسے ؟

اس کی تفصیل آپ کو

☆ نظام ربوبیت ☆

(از ۔ پرویز)

میں ملیگی جو دور حاضرہ کی عظیم کتاب ہے ۔

قسم اول : کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش ۔ چھہ روپے

قسم دوم : کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ ۔ چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ء ۔ کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار
طلوعِ اسلام
کراچی

جلد نمبر ۸ | کراچی ، ہفتہ - ۲۷ - اگست ۱۹۵۵ء | قیمت چھ آنہ
شمارہ ۳۰ | | سالانہ پندرہ روپے

قرآن نے کیا کہا؟

سابقہ اشاعت میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ صحیح نظام معاشرہ میں، ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری ''اللہ'' پر عائد ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ''اللہ'' کی یہ ذمہ داری پوری کس طرح سے ہوتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ خارجی کائنات میں خدا کا قانون از خود جاری و ساری ہے۔ کسی چیز کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ جی چاہے تو اس قانون کی پابندی کرے اور جی چاہے تو اس سے انکار کردے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں یہ پابندی از خود نہیں ہوتی۔ اسے خود اختیار کرنا ہوتا ہے۔ یہ مقصد اس جماعت کے ہاتھوں سر انجام پاتا ہے جو دنیا میں احکام خداوندی کو نافذ کرنے کیلئے وجود میں آتی ہے۔ لہذا انسانوں کی دنیا میں ''اللہ کی ذمہ داریاں'' اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو خدا کے احکام کو دنیا میں نافذ کرتا ہے۔ خدا انہیں براہ راست (از خود) پورا نہیں کیا کرتا۔ اس حقیقت کو سورہ یاسین میں اسطرح واضح کیا کہ۔ واذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں دے رکھا ہے اسے مفاد عامہ کے لئے کھلا رکھو تو۔ قال الذین کفروا للذین آمنوا انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ۔ تو جو لوگ صحیح نظام سے انکار کرتے ہیں وہ جماعت مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم انہیں کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود ہی کھلا دیتا؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ان انتم الا فی ضلال مبین (۳۶/۴۷)۔ تم لوگ کیسی حماقت کی باتیں کرتے ہو۔ خدا کسی کو براہ راست نہیں کھلایا کرتا۔ اسکا انتظام ہمارے تمہارے ہاتھوں سے کرایا کرتا ہے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

1. تنہا عقل انسانی، زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اس علم وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو بات بھی قرآن کے خلاف ہو گی وہ یقیناً غلط ہے۔
4. حضور نبی اکرم انسانیت کبریٰ کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن تاریخ و روایات میں بہت سی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس قسم کی چیزیں (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک ہی نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت کا نظام یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
8. ربوبیت عالمگیر کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

اسلامی پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے جو صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما کا کفیل ہو اور یوں "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ لمعات ★ اسوۂ حسنہ ★ میرے بھی صنم خانے ★ جدید ارباب شریعت کی دیانت ★ تاریخی شواہد
★ اسلام کی سرگزشت ★ مجلس اقبال ★ عورت کا قرآن ★ پاکستان غیروں کی نظر میں ★ ناقابل فراموش حقیقتیں
★ وہ اندھا جسنے پوری قوم کو آنکھیں دیں ★ نقد و نظر ★ باب المراسلات ★ عالم اسلامی ★ بین الاقوامی جائزہ

As. -/6/-

اسلامی نظام

قیمت -/-/۲ روپے

اقبال اور قرآن

اقبال نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور زبان شعر میں قرآنی پیغام لوگوں تک پہنچایا ۔

قرآن کے حقائق کیا ہیں اور اقبال کا پیغام کیا ہے؟ اس کا جواب ''اقبال اور قرآن'' میں ملیگا ۔

صفحات ۲۵۶ قیمت دو روپے

فردوس گم گشتہ

مفسر قرآن اور ترجمان اقبال جناب پرویز کے دلکش مضامین اور سحر آور تقاریر کا مجموعہ ۔ نوجوان طبقہ کے لئے فکر و عمل کی نئی دعوت ۔

صفحات ۳۱۲ قیمت چھ روپے

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۷ - کراچی - ۳

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸ | کراچی - ہفتہ، ۲۷ اگست ۱۹۵۵ء | نمبر ۳۰

اُسوۂ حسنہ

(ارباب شریعت کی خصوصی توجہ کیلئے)

رسول اللہؐ خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات (دین) لائے جس پر سب سے پہلے حضورؐ نے خود عمل فرمایا۔ آپ کے اس عمل کو عام اصطلاح میں سنت کہا جاتا ہے۔ جس کا تحریری ریکارڈ احادیث کے ان مجموعوں میں ملتا ہے جو مختلف ائمہ حدیث نے وقتاً فوقتاً مرتب کئے۔ چونکہ یہ مجموعے حضورؐ کی وفات کے بہت بعد مرتب ہوئے۔ اس لئے ان میں صحیح باتوں کے ساتھ غلط باتیں بھی شامل ہو گئیں۔ چونکہ رسول اللہؐ کی ساری زندگی قرآن ہی کے اتباع میں گذری تھی۔ اور قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے ان مجموعوں میں جتنی باتیں ایسی ہیں جو قرآن کے خلاف نہیں جاتیں۔ ان کے متعلق تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح ہیں۔ اس طرح قرآن کی روشنی میں اس ریکارڈ سے رسول اللہؐ کی ایسی سیرت ہمارے سامنے آجاتی ہے جو ہمارے لئے زندگی کی تاریکیوں میں شمعِ ہدایت اور تمام نوعِ انسانی کے لئے روشنی کے جگمگاتے مینار کا کام دیتی ہے۔ اسی کو رسول اللہؐ کا اسوۂ حسنہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ ماڈل جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان زندگی کے مقصودِ منتہیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ طوبیٰ لہم و حسن مآب۔

جزئیات کو چھوڑ کر بہ حیثیت مجموعی حضورؐ نے جس انداز کی زندگی بسر کی۔ اس کے متعلق علامہ شبلی نے مختلف کتب روایات وسیر کے حوالوں سے سیرۃ النبی (جلد اول) میں حسب ذیل تفصیل لکھی ہے۔

مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت جب تک مکہ معظمہ میں تھے تو پیغمبر تھے۔ مدینہ پہنچ کر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ تمام عرب کے زیرنگیں ہو جانے پر بھی فاقہ کش رہے۔ صحیح بخاری، باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں تین صاع جو پر گرو تھی۔ جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدود شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا ہے اور مدینہ کی سرزمین میں زر و مال کا سیلاب آچکا ہے۔ .... حضرت عائشہ فرماتی ہیں ولا یطوی لہٗ ثوب کبھی آپ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑہ کپڑا ہوتا تھا۔ دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہہ کر کے رکھا جا سکتا۔

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا۔ اور رات کو تو اکثر آپ اور سارا گھر بھوکا سوتا تھا۔

کان رسول اللہ یبیت اللیالی المتتابعۃ طاویا ھو واھلہ لا یجدون عشاء

آپ اور آپ کے اہل وعیال متصل کئی کئی رات بھوکے رہ جاتے تھے۔ کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ حضرت عائشہ نے ایک موقعہ پر جب یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن الزبیر نے پوچھا کہ آخر گذارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور۔ البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تھے تو پی لیتے تھے۔ آپ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی۔ میدہ جس کو عرب میں حواری اور نقی کہتے ہیں کبھی نظر سے نہیں گذرا۔ سہل بن سعد جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرتؐ کے زمانہ میں چھلنیاں نہیں تھیں؟ بولے نہیں۔ لوگوں نے کہا پھر آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے۔ بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے۔ جو رہ جاتا تھا اسی کو گوندھ کر پکا لیتے تھے

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیج دو۔ جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں آپ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا۔ وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ مختصراً یہ کہ آٹھ نو گھروں میں سے کہیں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے شکم کو کپڑے سے کس کر باندھا ہے سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے۔

ایک دفعہ صحابہ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ پتھر بندھے تھے۔ آپ نے شکم کھولا تو ایک کے بجائے دو دو پتھر تھے۔

(صفحہ ۳۴۹ تا صفحہ ۳۵۲)

یہ تو رہا زندگی بھر کا معمول۔ اب عمر کے آخری وقت کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے۔

بیہقی کی روایت ہے کہ اس بیماری (مرض الموت) کے ایام میں حضورؐ کے پاس سات دینار تھے۔ اور حضور فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو۔ لیکن اس کے بعد حضور پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپ کی تیمار داری میں مصروف ہو گئے۔ آپ کو ہوش ہوا تو فرمایا کہ انہیں لے آؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا جب کہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہو۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا۔

(اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری صفحہ ۲۵۰)

نیز سیرۃ النبی شبلی حصہ اول (صفحہ ۱۷۹)

یہ تھی وفات کے قریب کی مالی حالت۔ وفات کے بعد (ترکہ) کے متعلق اسی اصح السیر میں ہے

"یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مرض الموت میں وفات کے قریب حضورؐ کے پاس کل سات دینار تھے۔ اس کو خود حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے صدقہ کر دیا تھا۔ چند مکانات تھے۔ وہ ازواج مطہرات پر بٹے ہوئے تھے اور انہیں کے قبضے میں تھے۔ .... کچھ زمینیں تھیں۔ جلیل القدر اصحاب میں اس کی ملکیت کے متعلق اختلافات ہیں مگر صحیح یہی ہے کہ وہ فئی یا صدقہ کی زمینیں تھیں۔ اور من جانب اللہ اس پر تصرف کا حضورؐ کو کامل اختیار تھا۔ لیکن وہ ذاتی ملکیت نہ تھی جس میں وراثت جاری ہو سکے حضرت عائشہ فرماتی ہیں

ما ترک رسول اللہ درھما ولا دینارا ولا شاۃ ولا بعیرا ولا اوصی بشیئ (رواہ مسلم) حضورؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔ ام المومنین حضرت جویریہؓ کے بھائی عمرو بن الحارثؓ کی روایت بخاری میں ہے ما ترک رسول اللہ عند موتہ دینارا ولا درھما ولا عبدا ولا امۃ ولا شیئا الا بغلۃ البیضاء وسلاحہ وارضا جعلھا صدقۃ رسول اللہ

نے وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا، نہ درہم۔ نہ غلام نہ لونڈی، نہ کوئی اور شے۔ لیکن ایک سفید خچر اور سلاح جنگ اور زمینیں جسے حضورؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔" (ص ۵۲۵)

علامہ شبلی نے متروکات کے عنوان کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے۔

"آنحضرتؐ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات و جائدادوں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے کہ لا نورث ما ترکنا صدقۃ ہم (انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔ (ص ۱۵۵)"

(اس کے بعد انھوں نے بھی اپنی روایات کو درج کیا ہے۔ جو اوپر لکھی جا چکی ہیں۔)

یہ ہے حضورؐ کی معاشی زندگی کا وہ مجموعی نقشہ جو کتب روایات کی رو سے مرتب ہوتا ہے یہ روایات احادیث کے مختلف مجموعوں میں ہیں۔ لیکن (جہاں تک ہمیں معلوم ہے) ان کی صحت کے متعلق کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ ان سے یہ واضح ہے کہ۔

(۱) نبی اکرمؐ نے (بادشاہی کے زمانہ میں بھی) نہایت سادہ زندگی بسر فرمائی۔ ایسی سادہ کہ حضورؐ نے کبھی فالتو جوڑا کپڑوں کا بھی نہ رکھا۔

(۲) حضورؐ نے اپنے پاس کبھی مال جمع نہیں کیا۔ جو کچھ آتا تھا، اس سے اپنی کم از کم ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی رفاہ عامہ کے لئے صرف کر دیتے تھے

(۳) حضورؐ نے کوئی جائداد یا مال ترکہ میں نہیں چھوڑا جو کچھ اشیائے مستعملہ میں سے چھوڑا اس کے متعلق بھی فرما دیا کہ وہ عام مسلمانوں کا حق ہیں۔

ہمارے نزدیک حضورؐ کی حیات طیبہ کا یہ نقشہ اس لئے صحیح ہے کہ یہ قرآن کے منشاء کے عین مطابق ہے۔ حضورؐ جس قرآنی نظام کے قیام کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس میں نہ روپیہ جمع کرنے کی اجازت ہے۔ نہ زمین وغیرہ پر ذاتی ملکیت جائز اور جب یہ صورت ہو کہ نہ کسی کے پاس جمع شدہ روپیہ ہو اور نہ ہی ذاتی جائداد، تو پھر ترکہ اور وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (قرآن میں وراثت کے جو احکام ہیں وہ اس عبوری دور کے لئے ہیں جس میں ہنوز وہ نظام قائم نہ ہوا ہو۔ ویسے بھی وراثت کے احکام اسی پر نافذ ہوں گے جو ترکہ چھوڑ کر مرے۔ جس کا کچھ ترکہ ہی نہ ہو، اس پر ان احکام کا اطلاق ہی نہیں ہوتا) باقی رہی سادگی یا غریبی کی زندگی سو اسلام آسائش اور خوش حالی کی زندگی سے منع نہیں کرتا۔ لیکن حضورؐ جس قرآنی نظام کے داعی تھے اس میں آپ خوش حالی کی زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک باقی تمام افراد بھی اتنے ہی خوش حال نہ ہو جاتے۔ آج بھی اگر کوئی جماعت اس نظام کے قیام کے لئے اٹھے گی۔ تو اسے اس قسم کے فقر و فاقہ کو اپنے سر لینا ہوگا۔ اس میں صدر مملکت یا مرکز نظام کی زندگی سب سے زیادہ سادگی اور غریبی کی زندگی ہوگی۔ البتہ جوں جوں معاشرہ خوش حال ہوتا جائے گا تو وہ بھی اسی نسبت سے خوشحالی کی زندگی بسر کرے گا۔ اس نظام کے السابقون الاولون کے لئے تو پیہم محنت و مشقت اور عسرت و افلاس کی زندگی ہوتی ہے اور یہ سب کچھ ان کا اپنے اوپر خود عائد کردہ ہوتا ہے کیونکہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وہ خود عائد کردہ عسرت تھی جس کی وجہ سے حضورؐ اس قدر غریبی کی زندگی بسر فرماتے تھے۔

بہرحال یہ بات ہم نے محض ضمناً لکھدی ہے جو کچھ ہم کہہ رہے تھے وہ یہ تھا کہ حضورؐ کی زندگی کا جو نقشہ کتب سیرت سے مرتب ہوتا ہے وہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ یہاں سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب رسول اللہؐ کی زندگی یہ تھی تو اسی کو امت کے لئے اسوۂ حسنہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ حضورؐ کی اس زندگی کے متعلق وعظوں اور خطبوں میں تو بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن اسے بطور سنت یا اسوۂ حسنہ پیش نہیں کیا جاتا، نہ ہی اس پر عمل کیا جاتا اور کرایا جاتا ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین ضرور کی جاتی ہے لیکن از روئے شریعت جن باتوں کو ممنوع بتایا جاتا ہے وہ صرف مردوں کے لئے سونا اور ریشم پہننا اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانا پینا ہے جہاں تک مال جمع کرنے کا تعلق ہے یہ کھلے بندوں کہا جاتا ہے کہ نہ اس پر کسی قسم کی پابندی ہے۔ نہ کوئی حد بندی۔ جائز ذرائع سے جس قدر مال جمع کر لیا جائے، شریعت کی رُو سے بالکل درست ہے بشرطیکہ اس میں سے زکوٰۃ نکال دی جائے۔ اسی طرح ترکہ میں بھی جس قدر مال اور جائداد چھوڑی جائے سب جائز ہے بس اس کی تقسیم شریعت کے مقرر کردہ حصوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر لاکھوں روپے جمع کر کے رکھ لینے میں کوئی ہرج نہیں اگر ان میں سے زکوٰۃ دیدی جائے اور بے حد و نہایت جائداد بنا لینے اور اسے چھوڑ مرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ میراث کے قاعدے کے مطابق تقسیم ہو جائے تو پھر نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے کیا مفہوم ہے؟ اور وہ کن کے لئے اسوہ ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اُس قسم کی زندگی صرف رسول اللہؐ کے لئے مختص تھی۔ عام مسلمانوں کے لئے نہیں تھی تو ایک تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ جتنے احکام رسول اللہؐ کی ذات سے مخصوص تھے قرآن نے ان کی خود تصریح کر دی ہے۔ مثلاً ازواج مطہرات کو تبدیل کر سکنے کا حکم یا ان کے امہات المومنین ہونے کا حکم۔ قرآن نے اس کی تصریح کہیں نہیں کی کہ حضورؐ نے جس قسم کی مالی زندگی بسر فرمائی تھی۔ وہ ان احکام کے تابع تھی جو حضورؐ کے لئے مختص تھے۔ پھر دوسری بات یہ کہ اگر حضورؐ کی یہ ساری زندگی احکام خصوصی کے تابع تھی جن کا اطلاق دوسرے مسلمانوں پر نہیں تھا تو یہ زندگی امت کے لئے اسوہ کس طرح بن سکتی ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضورؐ کی زندگی مکمل اسلام کی مظہر تھی جس تک امت کے افراد نہیں پہنچ سکتے۔ تو پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندگی جس تک پہنچنا، دوسرے افراد کے لئے ناممکن ہو وہ ان کے لئے اسوہ (ماڈل) کیسے بن سکتی ہے؟ یہ تصور قرآنی تعلیم کے بھی خلاف ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ چونکہ دنیا میں انسان بستے ہیں اس لئے ہم نے انسانوں میں سے رسول بھیجے۔ اگر یہاں فرشتے بستے تو ہم فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتے (۱۷/۹۵) نیز قرآن میں اسوۂ حسنہ کا لفظ خصوصیت سے دو ہی شخصیتوں کے متعلق آیا ہے ایک حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے متعلق (۶۰/۴) اور دوسرے نبی اکرمؐ کے متعلق[1] (۳۳/۲۱) حضرت ابراہیم کی جس خصوصیت کبریٰ کے تذکرہ کے بعد اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس پیغام خداوندی کے مخالف ہیں ان سے کوئی قلبی تعلق نہ رکھا جائے۔ بعینہٖ یہی حکم دوسری جگہ عام مسلمانوں کے لئے بھی آیا ہے (۵۸/۲۲) اس سے ظاہر ہے کہ اگر مسلمانوں کے لئے حضرت ابراہیمؑ کی اس خصوصیت تک پہنچنا ناممکن ہوتا تو پھر انہیں بالتصریح اس خصوصیت کا حکم نہ دیا جاتا۔ یہی چیز نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ پر صادق آتی ہے۔ یعنی اگر مسلمانوں کے لئے اس تک پہنچنا ناممکن ہوتا۔ تو اسے ان کے لئے اسوہ قرار کیوں دیا جاتا؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ بات ناممکن کی نہیں بلکہ درجات کی ہے۔ جو مسلمان ان امور سے رک جاتا ہے۔ جنہیں شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے تو وہ دین کے پہلے درجے میں آجاتا ہے اس کے بعد وہ جس قدر اس میں پختگی حاصل کرتا اور آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ رسول اللہؐ ان مدارج کی بلند ترین سطح پر فائز تھے۔ لہٰذا پہلے درجہ کا مسلمان بھی متبع سنت ضرور ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ اتباع سنت میں ترقی کرتا جاتا ہے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ آخرالامر اسی رنگ میں رنگا جاتا ہے یہ ٹھیک ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس تیرہ سو سال میں امت کو اس آخری درجہ تک لانے کے لئے کیا کوششیں ہوئی ہیں؟ سابقہ تاریخ کو تو چھوڑیئے ہمارے دور میں تو یہی کیفیت ہے کہ جو مسلمان پہلے درجہ میں آجاتے ہیں انہیں مطمئن رکھا جاتا ہے کہ انھوں نے دین کا منشاء پورا کر دیا ہے اور وہ متبعین سنت رسول اللہؐ بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے زمیندار، کارخانہ دار صاحب جائداد، دولتمند جنھوں نے کروڑوں روپے جمع کر رکھے ہیں اگر وہ زکوٰۃ ادا کر دیتے ہیں یا ارباب شریعت کے بتائے ہوئے کاموں میں کچھ خیرات کا روپیہ دے دیتے ہیں تو انھیں متبعین شریعت ہونے کی سند مل جاتی ہے وہ خدا اور رسول کی رضا جوئی حاصل کر لیتے اور دین کا منشاء پورا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان سے کوئی نہیں کہتا کہ اتباع سنت اسی صورت میں مکمل ہوگی جب تم حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں ایسی زندگی بسر کرو گے کہ نہ تمہارے پاس کچھ جمع ہو اور نہ ہی تم کچھ ترکہ چھوڑو۔

ہم پاکستان کے ارباب شریعت سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ

(۱) نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کا جو مجموعی نقشہ کتب سیرت کی رُو سے پیش کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟

(۲) اگر وہ صحیح ہے تو امت کے لئے اس اسوۂ حسنہ کی اتباع ضروری ہے یا نہیں؟

(۳) اگر اس کی اتباع ضروری ہے، تو جو لوگ لاکھوں روپے جمع کرتے اور کروڑوں کی جائدادیں بناتے ہیں، اور ساری عمر

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کا ذکر جس مقام پر آیا ہے، جہاں آپ نے جنگ کے موقعہ پر بے مثال استقلال اور استقامت کا ثبوت دیا تھا اس لئے اس (اسوہ) کا تعلق اسی واقعہ سے ہے دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے حضورؐ کی پوری کی پوری زندگی کی طرف اشارہ ہے اس مقام پر ہم عموم اور خصوص کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔

یہی کچھ کرتے رہتے ہیں۔ انھیں متبع سنت رسول اللہ سمجھا جائے گا یا نہیں؟

(۴) اگر وہ لوگ متبع سنت رسول اللہ نہیں تو پاکستان کے مسلمانوں کو اس سنت نبوی پر چلانے کے لئے یہاں کیا کوششیں ہو رہی ہیں؟

اگر کوئی تحریک اس اتباع سنت کی دعوت دے اور ایسے اسلامی معاشرہ کے قیام کی کوشش کرے جس میں حضورؐ کے اس اسوہ حسنہ کی اتباع ممکن اور آسان ہو جائے تو ایسی تحریک کی تائید کرنی چاہیئے یا مخالفت؟

جو حضرات اس اہم موضوع پر سنجیدگی سے گفتگو کرنا چاہیں، طلوع اسلام نہایت خندہ پیشانی سے انھیں خوش آمدید کہے گا۔

میرے بھی صنم خانے!

ہم مسٹر کامنی کمار دتا کے مرکز میں وزیر قانون بنائے جانے پر ابھی کچھ لکھ نہیں سکے تھے کہ پاکستان کی آٹھویں سالگرہ پر آپ کا پیغام آزادی ہمارے سامنے آگیا۔ جو بوجوہ محتاج تبصرہ ہے لیکن اس پر گفتگو کرنے سے پیشتر ہم اپنے قصور فہم کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس کی بنا پر ہم یہ سمجھ نہیں سکے کہ آخر آپ کو کس مصلحت کی بنا پر وزیر چنا گیا اور قانون جیسا اہم شعبہ ان کے سپرد کر دیا گیا۔

موجودہ مرکزی وزارت مسلم لیگ اور متحدہ محاذ میں اختلاط (COALITION) کا نتیجہ ہے مسٹر دتا ان دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک کے بھی رکن نہیں، اس اعتبار سے ان کی آمد کو اختلاط کا لازمی نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ اسی کا شاخسانہ ہے۔ متحدہ محاذ کے متعلق یہ چھپی ڈھکی بات نہیں کہ اس کی رگ سیاست میں ہندو ہی کا خون زندگی دوڑ رہا ہے۔ ان کے مطلع سیاست پر ابھر آنے سے عنان سیاست ہندو کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ اس کا واضح اور بدترین ثبوت گذشتہ سال ملا تھا جب متحدہ محاذ کی حکومت پہلی مرتبہ مشرقی پاکستان میں برسر اقتدار آئی تھی۔ اس وقت ایسا کشت و خون ہوا کہ پاکستان کی بنیاد تک ہل گئی تھی۔ اگر مرکزی قیادت صوبائی حکومت کو برطرف کر کے اس سیلاب بلا کے سامنے بند نہ باندھ دیتی تو پاکستان کا جو حشر ہوتا اس کا تصور مشکل نہیں۔ ہمیں ہندو سے یونہی خدا واسطے کا بیر نہیں نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان پر کسی قسم کی شہری پابندیاں ہی لگائی جائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ہندو نے ابھی تک پاکستان کو قبول نہیں کیا اور وہ دل و دماغ سے ہندوستانی ہے۔ پاکستان میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاش نے بالکل صحیح کہا تھا کہ پاکستان ہندو کے لئے "روحانی مسئلہ" ہے۔ یعنی وہ اسے کسی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ آج ہم ہندو کی سیاست کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کی صداقت کا پورا پورا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ ذہنیت ہندو تک محدود ہوتی اور وہیں تک محدود رہتی تو ایک حد تک بات اور ہوتی، اور اس سے ہمارا مسئلہ دوسری نوع کا ہوتا لیکن "غیر پاکستانیت" کا زہر مسلمانوں کے دل و دماغ میں بھی حل کیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ روز اول سے جاری ہے نہ یہ از خود تھمتا ہے اور نہ اس کا تدارک ہی کیا گیا ہے۔ اس سے بنگال میں جو ذہنیت پیدا ہو گئی ہے وہ محب وطن پاکستانیوں کے لئے گہری سوچ اور قلبی اضطراب کا باعث ہے۔ متحدہ محاذ کے پہلی مرتبہ برسر اقتدار آنے پر جو زلزلے آئے وہ بڑے شدید تھے اور ہم انھیں ہر ایک نے محسوس کیا۔ اب ہر چند ایسے جھٹکے ختم ہو گئے ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ زمین ساکن ہو گئی ہے۔ بنگال میں ہندو مسلسل آبیاری کر رہا ہے اور اس کے بوئے ہوئے تخم ہائے خبیث برگ و بار لا رہے ہیں۔ مثلاً اس ماہ کے شروع میں صوبائی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو عبدالحکیم صاحب (متحدہ محاذ) کو کثرت رائے سے اسپیکر منتخب کیا گیا۔ آپ نے اپنی کامیابی پر تقریر کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔

مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کی روحیں دیکھ رہی ہیں اس لئے آپ بہتر طریق پر کام سر انجام دیجئے۔

ان الفاظ کو بغور دیکھئے۔ پتہ چلتا ہے کہ جس نوک نشتر کا ہم رونا رو رہے ہیں اس کی زد کہاں تک پہنچتی ہے۔ مہاتما گاندھی کی زندگی کا ایک ایک سانس مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں صرف ہوا۔ اب اگر ان کی روح پاکستان کی کسی صوبائی مقننہ میں آئے گی تو وہ اس کو شیرباد دینے کے لئے یقیناً نہیں آئے گی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ نئے اسپیکر نے کیسے فرض کر لیا کہ ان کی روح اسمبلی میں موجود ہے؟ کیا اس لئے کہ وہ انھیں سے روحانی اکتساب کرتے ہیں؟ اور پھر انھیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اگر گاندھی اور جناح کا تذکرہ ناگزیر ہی تھا تو جہاں ایک غیر ملک کے قائد کو مہاتما کہا گیا وہاں اپنے قائد کو قائد اعظم کے نام سے کیوں نہ یاد کیا گیا؟

قائد اعظم کا لقب ملت کے دل کی گہرائیوں سے ہی نہیں ابھرا تھا بلکہ پاکستان کی مجلس دستور ساز نے اس لقب پر قانونی مہر بھی لگا دی تھی۔ ہمیں مہاتما گاندھی سے کوئی بیر نہیں۔ انھوں نے پاکستان کی مخالفت کی تو ہم نے اس کے علی الرغم پاکستان بنا لیا۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ قائد اعظم کو مسٹر جناح کہنے سے ان کی عظمت پر حرف آ جاتا ہے۔ یہ عظمت تاریخ کی عطا کردہ ہے اور کوئی اسے مٹا نہیں سکتا۔ لیکن ہمارا مقصود اس ذہنیت کی طرف توجہ دلانا ہے جو ہندو کے دم سے پیدا ہو گئی ہے۔ معاصر "پاسبان" ڈھاکہ کی اطلاع ہے کہ مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ، مسٹر ابو حسین سرکار نے ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر میں ایک لائبریری کا افتتاح کیا تو دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی ذہنیت کو اسی سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے جس میں تقسیم سے پہلے نام نہاد نیشنلسٹ مسلمانوں کو ڈھالا جاتا تھا۔ وہ نام کے مسلمان تھے لیکن عملاً ہندو تھے۔ یہ زہر بڑی چابکدستی سے پھیلایا جا رہا ہے اور اس کیلئے چوٹی کی طرف سے آنے کا راستہ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ انہی کی مدد سے ملکی سیاست میں فتنے کھڑے کئے جا سکتے ہیں اور رخنے ڈالے جا سکتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ متحدہ محاذ کی وساطت سے یہ خطرہ حقیقی ہو گیا ہے۔ صوبے کا توازن اقتدار بالکل ہندو کے ہاتھ میں آ چکا ہے اور اب اس خطرے کا رخ مرکز کی طرف ہو گیا ہے۔

ان حالات میں متحدہ محاذ کے شریک حکومت ہونے سے ایک ہندو کا وزیر بن جانا بالکل قابل فہم ہے لیکن اس سے یہ کم قابل مذمت نہیں ہو جاتا۔ مسٹر دتا اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پاکستان کے لئے اسلامی آئین کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ بعض دفعہ اس گروہ کی طرف سے خود اسلام پر حملے ہوتے رہے۔ اس پر سابقہ مجلس دستور کی روئداد کافی شہادت ہے۔ اس گروہ کو اسلام کے نام سے اس حد تک کد تھی کہ اس نے اس پر بھی اعتراض کیا کہ پاکستان کے نام کے ساتھ جمہوریہ اسلامی کا اضافہ کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ جب آئین سازی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس گروہ نے یہ کہہ کر مجلس دستور ساز کا بائیکاٹ کر دیا تھا کہ چونکہ وہ اسلامی آئین وضع کر رہی ہے اس لئے وہ اس سے قطعاً تعاون نہیں کر سکتے۔ اب یہی مسٹر دتا صاحب مسودہ آئین کی تیاری کا ذمہ لیں گے۔ کیا وہ اسلامی آئین کی تسوید کو گوارا کر لیں گے یا اپنا سابقہ بائیکاٹ جاری رکھیں گے؟ ہم نا محرمان سراپردہ راز اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتے لیکن اگر کسی شخص کا ماضی اس کے مستقبل کا کسی حد تک آئینہ ہو سکتا ہے تو اس کا جو جواب دیا جا سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

اس کا ایک حد تک جواب مسٹر دتا کے نشریہ میں مل جاتا ہے۔ آپ نے گذشتہ آٹھ سال کی ناکامی کا ذکر کر کے کہا ہے کہ دنیا میں ملک کا وقار کم ہو گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ "عوام کے مفاد سے غداری کی گئی ہے"۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس سے مسٹر دتا کی حقیقی مراد کیا ہے۔ بظاہر ایسے نظر آتا ہے کہ ان کا روئے سخن اس کی طرف ہو کہ آج تک ملک کا آئین تیار نہیں ہو سکا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ناکامی بڑی شرمناک ہے لیکن ہم نئے وزیر قانون سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس ناکامی کی ذمہ داری ان پر بھی عائد نہیں ہوتی؟ تسوید آئین کی راہ میں اور کتنے ہی موانعات کیوں نہ ہوں کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ آپ اور آپ کے رفقاء نے بھی اس راہ میں کانٹے بکھیرے؟ آپ کا بائیکاٹ آخر کیا معنی رکھتا تھا؟ آپ شائد اپنے نظریات کی بنا پر اسے حق بجانب ثابت کر سکیں لیکن کیا اس سے نتیجہ اور اس نتیجے سے متعلق رائے بدل جائے گی؟ آپ کی کوششیں اگر رنگ نہیں لا سکیں تو یہ اتفاقی بات ہے، ورنہ آپ نے تو تسوید آئین کی مساعی کو بے نتیجہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور ہم یہ بھی پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اب آپ اس سلسلہ میں مناسب تعاون کا ثبوت دیجئے گا؟

یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ مسٹر دتا کس قسم کے تعاون کا مظاہرہ کر سکتے ہیں ہمیں دیکھنا ہو گا کہ عوام کا وہ مفاد کیا تھا جس سے بقول مسٹر دتا غداری کی گئی ہے؟ پاکستان کے عوام کا مفاد دیکھنے کے لئے ہمیں دیکھنا ہو گا کہ پاکستان کس بنا پر وجود میں آیا تھا۔ مسٹر دتا اس کو کسی نظر سے بھی کیوں نہ دیکھیں وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ اس خطہ ملک میں اسلامی نظام رائج کیا جائے گا۔ نہ محض تحریک پاکستان کا اقتضا یہی تھا بلکہ قائدین پاکستان نے قدم قدم پر آئین اسلامی کی تسوید ہی کا وعدہ کیا ہے اور اس کو ایفا کرنے کے دعوے باندھے ہیں۔ گویا اب مفاد عوام سے غداری آئین

کا نہ بنانا نہیں بلکہ اسلامی آئین کی تسوید سے گریز کرنا ہے۔ ان حالات میں اگر اچھے سے اچھا آئین بھی بنا دیا گیا تو جب تک وہ اسلام کے اصولوں پر مبنی نہیں ہوگا اس کوشش کو مفادِ پاکستان سے غداری ہی قرار دیا جائیگا۔ کیا مسٹر دتا "غداری" کے لفظ سے یہی مراد لیتے ہیں۔

وہ اسے کسی معنی میں بھی استعمال کیوں نہ کریں پاکستان کے عوام اس کی یہی اور صرف یہی تعبیر کریں گے۔

مسٹر دتا نے نشریہ میں اقلیتوں کی بزعمِ خویش پوزیشن واضح کی ہے۔ آپ نے کہا کہ تسویۂ آئین کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اقلیت کا لفظ آئین میں نہیں ملے گا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اقلیتوں سے مطالبہ کیا کہ وہ پاکستان کے وفادار شہری بن جائیں اور احساسِ کمتری اور بد دلی کے جذبات سے پاک ہو جائیں اور یہ مطالبہ کریں کہ انھیں زندگی کے تمام شعبوں میں مساوی مواقع دیئے جائیں۔ ان الفاظ کا مفہوم بالکل ظاہر ہے مسٹر دتا کے تصور کے مطابق جو آئین بنے گا اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ یعنی بالفاظِ دیگر وہ اسلامی نہیں ہوگا۔ گویا جہاں تک مسٹر دتا کا تعلق ہے ان کی ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ بدستور لادینی اور غیر اسلامی آئین کے لئے کوشاں رہیں گے۔

ہم اس موقع پر اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اسلامی آئین میں غیر مسلموں کا مقام و منصب کیا ہے اور ان کے حقوق اور ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں (ان امور پر طلوعِ اسلام میں مفصل بحث کی جا چکی ہے) لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کی پوزیشن وہی ہوگی جو از روئے قرآن ہو سکتی ہے۔

وہ مسلم قوم کے افراد نہیں شمار کئے جائیں گے اس لئے کہ قرآن کی رو سے مسلم قوم کا وجود آئیڈیالوجی کی بنا پر تشکیل پاتا ہے اور جو لوگ اس آئیڈیالوجی میں شریک نہ ہوں وہ اس قوم کے افراد نہیں بن سکتے خواہ وہ ایک ہی ملک کے باشندے کیوں نہ ہوں اس لئے یہ کہنا کہ آئینِ پاکستان کی تسوید کے بعد اقلیت کا لفظ پاکستان میں نہیں ملیگا۔ یہاں کے مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی طرف لے جانے کے مرادف ہے۔ وہی متحدہ قومیت جسے ہم نے اسلامی تصور کی رو سے ٹھکرا کر پاکستان حاصل کیا تھا۔ یہ سب کچھ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے جس میں مسٹر دتا کی خواہشات تو ایک طرف ہم اپنی خواہشات کے مطابق بھی ایک شوشہ کی کمی نہیں کر سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسٹر دتا اور ان کے رفقاء ہی نہیں بلکہ پاکستان کے تمام دستور ساز اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ اسلام اور پاکستان دونوں سے غداری ہوگی۔

جہاں تک ایک اسلامی مملکت میں کسی غیر مسلم کے بہ حیثیت وزیر قانون متعین ہو جانے کے سوال کا تعلق ہے تو اسلامی تعلیم کی رو سے کوئی اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ باقی رہا ان غیر مسلم حضرات کی وفا شعاری کا سوال۔ سو اس کے لئے مسٹر منڈل کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

اربابِ شریعت کی دیانت

آج سے ذرا پہلے تک ہمارے ہاں علمائے شریعت کی بالعموم یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے عقائد میں بڑے پختہ اور متشدد ہوتے تھے اور مخالف فرقے کے معتقدات پر کڑی سے کڑی تنقید کرتے تھے لیکن اس تنقید میں ان کا مسلک یہ ہوتا تھا کہ مخالف کے عقائد کو اسی کے الفاظ میں بیان کرتے اور پھر ان کی تردید کرتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ خود اپنے ذہن سے مخالفین کے عقائد کو وضع کرتے اور پھر انھیں بنائے اعتراضات بنا لیتے۔ وہ خدا سے ڈرتے تھے اور اس قسم کی حرکات کو دیانت اور تقویٰ کے خلاف سمجھتے تھے لیکن ہمارے دور کے مدعیانِ شریعت کی کیفیت بالعموم ان سے مختلف ہے۔ اب یہ فریقِ مخالف کے متعلق خود ہی کچھ باتیں وضع کرتے ہیں۔ اور ان باتوں کو اُس کی طرف منسوب کرکے سب و شتم کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ وہ بیچارہ لاکھ چلاتے کہ یہ میرے معتقدات نہیں اس کی ایک نہیں سنتے۔ اپنا پروپیگنڈہ بدستور جاری رکھتے ہیں۔ اس کی ایک بین مثال لیجئے۔ طلوعِ اسلام کو ایک عرصے سے منکرِ حدیث اور منکرِ سنت قرار دے کر ہدفِ طعن و تشنیع بنایا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ ان عقائد کی بنا پر کیا جا رہا ہے جو طلوعِ اسلام کے نہیں ہیں۔ بلکہ ان پروپیگنڈہ کرنے والوں نے خود ہی اپنے ذہن سے تراش رکھے ہیں۔

طلوعِ اسلام نے اپنے مسلک کو واضح اور صاف کرنے کے لئے اپنی ۲؍ اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں "سنتِ رسول اللہ" کے عنوان سے ایک اداریٰ مقالہ لکھا جس میں بتایا کہ اس باب میں طلوعِ اسلام کا عقیدہ اور مسلک کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان تمام مخالفین سے درخواست کی کہ وہ براہ کرم یہ بتائیں کہ اس عقیدہ اور مسلک میں کونسی غلطی ہے۔ تاکہ اگر وہ فی الواقعہ غلطی ہو تو طلوعِ اسلام اپنی اصلاح کر سکے۔

طلوعِ اسلام میں اس مسلک کی وضاحت کے بعد ہم نے مخالف گروہ کے مشہور افراد مثلاً محترم امین احسن صاحب اصلاحی اور نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں نجی خطوط لکھ کر ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ اس کے بعد ۲؍ اپریل اور ۳۰؍ اپریل کے طلوعِ اسلام میں ہم نے اس درخواست کو دہرایا۔ ۷؍ مئی کے شمارہ میں محترم امین احسن صاحب اصلاحی اور عبدالغفار حسن صاحب سے اس ضمن میں مزید استفسار کیا۔ ۱۴؍ مئی کے طلوعِ اسلام میں محترم مودودی صاحب سے بھی درخواست کی اور اس درخواست کو پھر ۲۸؍ مئی کے شمارہ میں دہرایا۔

اس کے بعد ہم اس وقت تک دیکھ رہے ہیں کہ ان حضرات یا ان کے دیگر رفقاء نے نہ اپنی کسی تقریر اور نہ کسی تحریر میں طلوعِ اسلام کے اس اداریٰ مقالہ کا کوئی ذکر کیا ہے اور نہ ہی کہیں یہ کہا ہے کہ طلوعِ اسلام نے حدیث اور سنت کے متعلق اپنا یہ مسلک بتایا ہے لیکن اس کے برعکس وہ ان باتوں کو بار بار دہرائے چلے جا رہے ہیں جو طلوعِ اسلام کی طرف غلط منسوب کی جاتی ہیں اور اس طرح اس کے خلاف اپنی مہم کو برابر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگائیے کہ جن حضرات کا مذہبی معاملات میں بھی دیانت اور تقویٰ کا یہ عالم ہے۔ دوسرے معاملات میں ان سے کس قسم کی توقع کی جا سکتی ہے؟ لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس ہمیں اس طبقہ پر ہے جو ان حضرات کی باتیں سنتا اور ان کی تحریریں پڑھتا ہے۔ لیکن ان سے یہ نہیں کہتا کہ آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک کو جو اس نے اپنی ۲؍ اپریل کی اشاعت کی اشاعت میں خود واضح کیا ہے، سامنے رکھ کر پھر اعتراض کیجئے۔ کیا ہم اس سے اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ہمارے ہاں مذہب سے دلچسپی رکھنے والوں کا پورے کا پورا طبقہ اس سطح پر پہنچ چکا ہے۔ یہ نتیجہ افسوسناک ہی نہیں خطرناک بھی ہے۔ اور اس کی خطرناکی اس وقت سامنے آئے گی جب ہنگامی تحریکیں ختم ہو جائیں گی جن میں لوگوں سے کہا یہ جا رہا ہے کہ "دین کی اقامت" کے لئے مخالفین کے خلاف ہر حرکت موجبِ ثواب ہے کیونکہ اس سے مقصود دین کی خدمت ہے، اور ہم یہ دیکھنے کے قابل ہو سکیں گے کہ یہ ہمارے معاشرے کے اخلاق کو کہاں سے کہاں پہنچا گئی ہیں۔

بین الاقوامی جائزہ

امریکہ اور چین کے سفیروں کے جو مذاکرات اس ماہ کے آغاز میں جینیوا میں شروع ہوئے تھے وہ ابھی تک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ تازہ اطلاعات سے مترشح ہوتا ہے کہ گردش پرکار کی سی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اسے نہ تعطل کہا گیا ہے نہ انقطاع تک نوبت آنے کی توقع ہے۔ کیونکہ ان کی فضا جیسی بھی ہو فریقین مذاکرات کو جاری رکھنے پر بدستور آمادہ ہیں۔ فی الحال ان کا یہی پہلو قابلِ ذکر اور امید افزا ہے۔

ابتداءً ان مذاکرات کا محور امریکی شہریوں کی چینی حراست سے رہائی ہے۔ چین اس معاملہ کو دیگر تنازعات سے متعلق سودا بازی کا ذریعہ ضرور بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ مذاکرات کا رخ دوسری طرف موڑنے میں مصروف رہتا ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ ہے کہ مذاکرات اب تک بے نتیجہ رہے۔ حالانکہ آغاز میں یہ توقع عام طور پر پائی جاتی تھی کہ مطلوبہ قیدیوں کی رہائی عمل میں آ جائے گی چین بدستور سابق مشرق بعید سے متعلق عمومی معاہدے کا تصور ابھار ابھار کر پیش کر رہا ہے۔ امریکہ اسے ناقابلِ عمل سمجھتا ہے۔ در اصل موجودہ بین الاقوامی کشمکش کے پس منظر میں یہ ہے بھی ناقابلِ عمل۔ اگر ان عمومی امور کی بجائے خصوصی امور کو پیشِ نظر رکھا جائے اور فرداً فرداً ان سے متعلق معاملہ طے کیا جائے تو تصفیہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اتفاق سے ایسے حوادث رونما ہو رہے ہیں۔ جن سے امریکی اور چینی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ اس کا مرکزِ ثقل فی الحال کوریا ہے۔ کوریا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہے اور ایک غیر جانبدار کمیشن وہاں مصروفِ کار ہے جو معاہدہ کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس کے دو ارکان پولینڈ اور چیکوسلواکیہ ہیں جو کمیونسٹ ہیں ان کے متعلق عام طور پر کہا جا رہا ہے کہ وہ علانیہ کمیونزم کے لئے فضا سازگار کر رہے ہیں۔ جنوبی کوریا کے صدر سنگمن ری ان پر سختی سے تنقید کر رہے ہیں چنانچہ ان کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے ہیں اس صورتِ حال کا چین فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کی تجویز ہے کہ کوریا کا معاملہ ایک وسیع ایشیائی کانفرنس کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ اس کے تجویز کردہ ایشیائی معاہدے کی دوسری شکل ہے۔ امریکہ بھی کوریا کا سنجیدگی سے مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ غیر جانبدار کمیشن کے اشتراکی ارکان کی نقل و حرکت محدود کر دی جائے۔ اس

تاریخی شواہد

(۲۸)

دوسرے مقام پر ہے

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ۝ (۱۱/۶۶)

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آ پہنچا، تو ہم نے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا (اے پیغمبر!) بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے۔

اس لئے کہ وہ مومنین و متقین کی جماعت تھی۔

وَأَنجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ (۲۷/۵۳ و ۴۱/۱۸)

اور (دیکھو) ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے ہلاکت سے محفوظ رکھا اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ تھے بھی متقی (اس لئے اسکے مستحق تھے)

ان بقایائے ثمود سے جو نسل آگے بڑھی انھیں ثمودِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

یہ ہے قومِ ثمود کی داستانِ عبرت انگیز جو ہر صاحبِ علم و بصیرت کے لئے اپنے اندر سامانِ عبرت رکھتی ہے۔ اور جن کی اجڑی ہوئی بستیاں ہر رہگذر سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ع

دیکھو ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (۲۷/۵۲)

چنانچہ یہ ان کے مکانات ویران پڑے ہیں۔ بلاشبہ (ان کی) اس (عبرت انگیز تباہی) میں ان لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہیں (بڑی) نشانی ہے۔

یہی داستان کو قرآن کریم نے بغیر نام لئے سورۃ المومنون کی چند آیات میں یوں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ قومِ نوح کی غرقابی کے بعد ارشاد ہے

ثُمَّ أَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝ فَأَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ ۝ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ۝ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ۝ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ ۝ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ ثُمَّ أَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ ۝ (۲۳/۳۱-۴۲)

پھر ہم نے قومِ نوح کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا۔ ان میں بھی) اپنا رسول بھیجا جو خود انہی میں سے تھا (اس کی دعوت بھی یہی تھی) "اللہ ہی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار و فساد کے نتائج بد سے) ڈرتے نہیں؟ اس قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، اور آخرت کے پیش آنے سے منکر تھے اور جنھیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی دے رکھی تھی (لوگوں سے) کہنے لگے اس سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ جو کچھ تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کر لی، تو بس سمجھ لو، تم تباہ ہوئے۔ تم سنتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ یہ تمہیں امید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض مٹی اور ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے۔ تو پھر تمہیں موت سے نکالا جائے گا۔ کیسی ان ہونی بات ہے؟ کیسی ان ہونی بات ہے جس کی تمہیں توقع دلاتا ہے! (بھلا دوبارہ زندہ ہونا کیسا!) زندگی تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں ہم بسر کرتے ہیں۔ یہیں مرتے ہیں۔ یہیں جینا ہے۔ ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ مر کر پھر جی اٹھیں۔ کچھ نہیں یہ ایک مفتری آدمی ہے جس نے اللہ کے نام سے جھوٹ موٹ بات بنا دی۔ ہم کبھی اس کی بات ماننے والے نہیں۔ اس پر رسول نے کہا۔ خدایا! انھوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر! حکم ہوا عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ یہ اپنے کئے پر شرمسار ہوں گے۔ چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے انہیں آ پکڑا۔ اور ہم نے خس و خاشاک کی طرح انھیں پامال کر دیا۔ تو محرومی ہو اس گروہ کے لئے کہ ظلم کرنے والا ہے! پھر ہم نے ان کے بعد قوموں کے اور بہت سے دور پیدا کئے۔

اور اس کے بعد وہ نقطہ ماسکہ جو قوموں کی موت و حیات کے لئے ایک اٹل قانون کی حیثیت لئے ہوئے ہے یعنی۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝ (۲۳/۴۳)

کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے!

یہ وقتِ معین (اجل) کسی قوم کے اجتماعی اعمال کے ظہورِ نتائج کا نام ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو ظلم اور زیادتی سے ہلاک نہیں کرتا۔ یہ ہلاکت ان کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ۝ (۱۱/۱۱۷)

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو (یونہی) ظلم سے ہلاک کر دے درآنحالیکہ ان کے بسنے والے (باقی رہنے کی) صلاحیت رکھتے ہوں

سورۃ حج کی مندرجہ صدر آیات کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم اس زندگی کو آخری زندگی سمجھے وہ کبھی اپنی عیش سامانیوں کو چھوڑ کر نوعِ انسانی کی پرورش کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تو صرف وہی آمادہ ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ زندگی کو مسلسل آگے چلنا ہے اور اگلی زندگی میں خوشگواریوں کا معیار یہ ہے کہ اس زندگی میں دوسروں کی پرورش کے لئے کیا کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن سرمایہ پرستی کے خون آشام نظام کو مٹانے کے لئے ایمان بالآخرۃ کو بنیادی تصور قرار دیتا ہے۔

اسلام کی سرگزشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کی قومی خصوصیات اور زمانۂ جاہلیت میں ان کی حیاتِ عقلیہ کی کیفیت بیان کی جا چکی ہے۔ عربوں کی حیاتِ عقلیہ کے مظاہر میں سے لغت، زبان اور شعر و شاعری کا بیان ہو رہا تھا۔ آج کی صحبت میں عربوں کی ضرب الامثال سے گفتگو کی جائیگی کہ وہ کیونکر ان کی حیاتِ عقلیہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔

(ج) ضرب الامثال

لغتِ عربی کے علماء کا بیان ہے کہ "مَثَل" کا لفظ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے۔ هٰذا مَثَلُ الشَّيْءِ و مِثْلُهُ (یہ چیز فلاں چیز کے مثل ہے) یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہہ یا کرتے ہیں۔ هٰذا شِبْهُهُ و شَبَهُهُ، کیونکہ اس میں اصل معنی تشبیہ ہی کے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد "مَثَل" کا استعمال ہر رواج پذیر حکمت کی بات پر ہونے لگا۔ دوسرے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ عبرانی زبان سے ماخوذ ہے، عبرانی زبان میں ایک لفظ "مشل" موجود ہے جو اسی مفہوم پر بلکہ اس سے بھی زیادہ وسیع مفہوم پر بولا جاتا تھا۔ عبرانی زبان والے مروّج حکمت کی باتوں پر بھی اس لفظ کا اطلاق کرتے تھے اور نتیجہ مختصر حکایتوں اور قصوں کہانیوں پر بھی۔ بہرحال ہمیں تو ضرب الامثال پر محض اس نقطۂ نظر سے بحث کرنی ہے کہ اس سے کسی قوم کی عقلیت پر کس قدر روشنی پڑ سکتی ہے۔ کسی قوم کی ضرب الامثال سے ہم یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی عقلیت کس درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ نیز اس قوم کے بہت سے اخلاق و عادات کا کھوج لگا سکتے ہیں۔

اس اعتبار سے ضرب الامثال کو اشعار پر ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ اشعار تو محض ایک خاص طبقہ کے لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو عوام کی سطح سے بہرحال اونچی سطح پر ہوتے ہیں۔ شعراء قبیلہ کے صرف ان احوال و ظروف کو بیان کرتے ہیں جو اس قوم کے بلند مرتبہ اذہان میں مرتسم ہو چکے ہوں —— یہ بلندی کسی نوع ہی کی کیوں نہ ہو —— پھر وہ ان احوال و ظروف کو ایسے سانچوں میں ڈھلے ہوئے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں جو شعر کے مناسب ہو سکیں۔ لیکن ضرب الامثال زیادہ تر خود افرادِ قبیلہ کے تابع ہوتی ہیں اور عام لوگوں کی عقلیت کا اظہار کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضرب الامثال میں عموماً بہت ہی ان گڑھ الفاظ ملتے ہیں۔ یعنی وہ ان کے لئے ادیبوں یا بلند مرتبہ عقلاء کی طرح الفاظ کا انتخاب نہیں کرتے۔ مثلاً ایک ضرب المثل ہے۔ "گوہ سب سے پہلے اپنی دُم باہر نکالتی ہے" یا یہ ضرب المثل ہے۔ "ام قبیس اور ابو قبیس دونوں ہی جنگل کو اسی طرح گندہ کرتے ہیں جیسے حلوے کے اجزاء کو گندہ کیا جاتا ہے"!

زیادہ تر اسکی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ عربی کی بعض ضرب الامثال اس قسم کی ملتی ہیں جن کے معنی تفصیلاً سمجھ میں نہیں آتے بلکہ محض اجمالاً سمجھے جا سکتے ہیں۔ ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب جمہرۃ الامثال میں اس ضرب الامثال "كَعَيْثٍ مَا أَرْنَبَتُكَ" کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے معنے "جلدی کرو" کے ہوتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ اس کے یہ معنی کسی سے سن کر ہی معلوم ہو سکتے ہیں ورنہ ضرب المثل میں خود کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جس کے یہ معنی ہو سکتے ہوں۔ اس سے یہ پتہ بھی چل جاتا ہے کہ عربی زبان ہم تک مکمل نہیں پہنچ سکی۔ اس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کو علماء نے اب تک نہیں پہچانا۔

آ • •

میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم تک شعر و خطابت وغیرہ کے جو نمونے پہنچے ہیں وہ شعراء اور ادیبوں کی صاف ستھری اور نکھری ہوئی زبان تو ہو سکتی ہے مگر قوم اور عوام کی زبان نہیں ہو سکتی۔ بعض ضرب الامثال کے سوا عام لوگوں کی زبان ہم تک پہنچ ہی نہیں سکی۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ساری ضرب الامثال ہی تعبیر کے لحاظ سے ناقص اور الفاظ کے اعتبار سے غیر شستہ ہیں بلکہ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ضرب الامثال پوری قوم کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ایک ضرب المثل بعض اوقات ایک ترقی یافتہ طبقہ میں پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے تخیل کے لحاظ سے خود بھی ترقی یافتہ ہوتی ہے اور اس کے الفاظ بھی پاکیزہ ہوتے ہیں۔ کبھی ایک ضرب المثل عام لوگوں میں پیدا ہوتی ہے تو وہ ایسی نہیں ہوتی۔ لیکن شعر تو بہرحال شعراء کے طبقہ ہی میں پیدا ہوتا ہے جو عادۃً قوم کے عوام کے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ یہ شعراء اگر معنوی لحاظ سے ترقی یافتہ مضامین پیش نہ کر سکیں تو کم از کم پاکیزہ الفاظ سے تو محروم نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے ضرب الامثال کو قوم کی آواز قرار دیا ہے۔ چنانچہ قوم کی زبان پر ضرب الامثال کے ذریعہ سے جو روشنی پڑتی ہے۔ وہ اس روشنی سے زیادہ صاف ہوتی ہے جو شعر کے ذریعہ سے پڑتی ہے۔

محققین کی رائے یہ ہے کہ ضرب الامثال میں ایک قسم ایسی ضرب الامثال کی ہے جو تمام قوموں میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور دوسری قسم ان ضرب الامثال کی ہے جس میں ایک قوم دوسری قوم سے اختلاف رکھتی ہے۔ پہلی قسم کی ضرب الامثال اس بحث کا موضوع بن سکتی ہیں کہ قومیں ان ضرب الامثال میں متفق کیونکر ہو گئیں؟ خصوصاً ان زبانوں والی قومیں جن کی اصل ایک ہی ہے مثلاً سامی زبانوں میں ایک دوسرے سے قریب تر ضرب الامثال ملتی ہیں مثلاً بعض عربی ضرب الامثال میں امثالِ سلیمان کے ساتھ قریبی مشابہت ملتی ہے جن میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا انھیں عربی قالب میں ڈھالنے کے لئے ضروری ہو سکتا تھا۔ یا عربی ذوق سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے خفیف سی تبدیلی ضروری ہو سکتی تھی۔ اور دوسری قسم کی ضرب الامثال اس بحث کا موضوع ہو سکتی ہیں کہ اس قوم میں یہ ضرب الامثال کیوں پیدا ہوئیں اور دوسری قوموں میں دوسری ضرب الامثال کیوں پیدا ہوئیں؟ ایک زراعت پیشہ قوم کی ضرب الامثال اس کی کھیتی باڑی سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک تجارت پیشہ قوم کی ضرب الامثال اسکی تجارت سے —— وقس علیٰ ہٰذا۔ عربی زبان کی ضرب الامثال کو لیکر تم اس قاعدہ کو عربوں پر بھی منطبق کر سکتے ہو۔ ان کی ضرب الامثال زیادہ تر اونٹوں اور اونٹنیوں کے متعلقات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ان کی ضرب المثل ہے اِسْتَنْوَقَ الْجَمَلُ (اونٹ تو اونٹنی بن گیا) اور اِنَّمَا يَجْزِي الْفَتٰى لَيْسَ الْجَمَلُ (بدلہ تو نوجوان آدمی دیا کرتا ہے۔ اونٹ نہیں دیا کرتا ——) اور اَغُدَّةٌ كَغُدَّةِ الْبَعِيْرِ؟ (کیا یہ ایسی ہی رسولی ہے جیسے اونٹ کے رسولی ہوا کرتی ہے؟) اسی طرح ان کی ضرب الامثال کا تعلق دودھ اور ذبح کردہ اونٹوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر قریش کی ضرب الامثال کو تلاش کرنا شروع کرو تو ان کی ضرب الامثال سے یہ چیز نمایاں طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ ایک تجارتی قوم کی ضرب الامثال ہیں۔ مثلاً ان کی ضرب المثل ہے۔ "لَا فِي الْعِيْرِ وَلَا فِي النَّفِيْرِ" (نہ تجارتی قافلہ میں ہے اور نہ فوجی کارواں میں) وغیر ذٰلک

عربی ضرب الامثال سے اگر اس جہت سے استفادہ کرنے کی کوشش کی جائے تو عموماً اس کے راستہ میں دو چیزیں مانع ہوا کرتی ہیں۔

(اول) زمانۂ جاہلیت کی ضرب الامثال زمانہ مابعد اسلام کی ضرب الامثال کے ساتھ خلط ملط ہو گئی ہیں حتیٰ کہ دونوں کو الگ کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ ان ضرب الامثال سے عربوں کی حیاتِ عقلیہ پر کوئی استدلال قائم کرنے سے پہلے اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ یہ ضرب الامثال کس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یزید بن معاویہ کے عہد میں "علاقہ الکلابی" نے ضرب الامثال کو جمع کیا تھا۔ اگر یہ مجموعہ ہم تک پہنچ جاتا تو یقیناً بہت مفید ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ انھوں نے اپنے اس مجموعہ میں لازماً زمانۂ جاہلیت اور ابتداء اسلام کی ضرب الامثال ہی بیان کی ہوں گی۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مجموعہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔

البتہ کچھ دوسرے دلائل ہو سکتے ہیں جن سے اکثر ہمیں کسی ضرب المثل کا منبع اور سرچشمہ معلوم ہو جاتا ہے جس کے کئی طریقے ہیں۔

(۱) بہت سی ایسی امثال ہیں جو تاریخی حوادث و واقعات کے بارہ میں کہی گئی ہیں جیسے جَزَاءُ سِنِمَّارٍ، مَوَاعِيْدُ عُرْقُوْبٍ، لَا فِي الْعِيْرِ وَلَا فِي النَّفِيْرِ، اور تَسْمَعُ بِالْمُعَيْدِيِّ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ تَرَاهُ وغیرہ کہ اس قسم کی تمام ضرب الامثال کا تعلق کسی نہ کسی تاریخی واقعہ سے ہے اور جب تاریخی واقعہ کی صحت ثابت ہو جائے تو ان سے متعلق ضرب الامثال کی دلالت بھی ان امور پر صحیح ہو گی جن کے بارے میں وہ کہی گئی ہوں۔

مجلسِ اقبال *

اسرارِ خودی

(باب اول)

باب اول کے ابتدائی اشعار میں جو سابقہ قسط میں پیش کئے جاچکے ہیں، علامہ اقبال نے یہ بتایا ہے کہ کائنات کا تخلیقی طریق کار یہ ہے کہ ایک شے وجود میں آتی ہے، اس کے بعد اس کی تزئین و تحسین شروع ہوتی ہے اور اس طرح وہ ارتقائی مراحل طے کرتی اپنے منتہیٰ و مقصود کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس طریقِ کار میں فطرت کو کسی شے میں حسن کا اضافہ کرنے کے لئے بہت سی توانائیاں اور سازوسامان ضائع کرنا پڑتا ہے اور اس اسراف و سنگدلی کا عذر ہوتا ہے

خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

اسی سلسلہ میں وہ اس کے بعد کہتے ہیں کہ۔

حسنِ شیریں عذرِ دردِ کوہ کن ۔۔۔ نافۂ عذرِ صد آہوئے ختن

فرہاد کی کوہ کنی اس کی پیہم مشقتیں اور جگر پاشیاں اور اس کا عمر بھر کا درد و کرب، ان سب کی وجہ جواز شیریں کا حسن تھا۔ اور دشت میں سینکڑوں ہرنوں کی ضیاع کا جواز مشک کا ایک نافہ

سوزِ پیہم قسمتِ پروانہ ہا ۔۔۔ شمع عذرِ محنتِ پروانہ ہا

پروانوں کی تقدیر میں جلنا اور پیہم جلنا ہے۔ اور ان کے اس تب و تاب اور سوز و گداز کی وجہِ جواز شمعِ محفل کے حسن کی تابندگیٔ و درخشندگی۔

خامۂ او نقشِ صد امروز بست ۔۔۔ تا بیارد صبحِ فردائے بدست

نقاشِ فطرت کا قلم، امروز کے خاکہ میں ہزاروں رنگ آمیزیاں کرتا اور اس کے خط و خال کو ابھارتا اور نکھارتا ہے تاکہ اس سے صبحِ فردا کی نمود ہو جائے۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت ۔۔۔ تا چراغِ یک محمدؐ برفروخت

اس کا یہ انداز نوعِ انسانی کے سلسلہ رشد و ہدایت میں بھی جاری و ساری رہا، حضرات انبیائے کرام کی مسلسل تگ و تاز اور ان کی پیہم قربانیاں اس لئے تھیں کہ یہ سلسلہ بتدریج آگے بڑھتا ہوا حضور خاتم النبیینؐ کی ذات تک منتج ہو جائے۔

اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرات انبیائے کرام کی تعلیم اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں اور اپنی اپنی قوم کے تمدنی اور معاشرتی ضروریات کے مطابق ہوتی تھی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی تعلیم کے اصول اسی طرح سے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی تک پہونچے تھے۔ اصولی طور پر یہ تعلیم اول سے آخر تک ایک ہی تھی یعنی اصولی اعتبار سے جو پیغام حضرت نوحؑ نے دیا تھا وہی پیغام نبی کریمؐ کی وساطت سے دنیا تک آیا۔ وحی اور انسان کی عقلی تعلیم میں فرق ہی یہ ہے کہ انسانی عقل تجرباتی طریق سے آہستہ آہستہ ٹھوکریں کھاتی اور گرتی پڑتی، دور دراز راہوں سے منزلِ مقصود تک پہنچتی ہے۔ لیکن خدا کی وحی براہ راست حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کا طریق تجرباتی اور تدریجی طور پر پختگی اور تکمیل حاصل کرنے کا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مختلف انبیائے کرام کی تگ و تاز اس لئے تھی کہ ان کا پیغام مختلف تدریجی مراحل طے کرتا ہوا تکمیل تک پہنچ جائے۔ ان کا پیغام پہلے ہی دن مکمل اور مبنی علی الحقیقت تھا۔ البتہ اس پیغام کی عملی شکلیں زمانہ کی سطح کے ساتھ بدلتی اور بلند ہوتی رہتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بھی بالعموم اصولی تعلیم کو پیش کیا ہے۔ تاکہ ان کی عملی شکلیں زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی اور بڑھتی چلی جائیں۔ مندرجہ بالا شعر سے یہی مفہوم لینا چاہیے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ بہتر تھا کہ حضرت علامہ اپنے نکتہ کی وضاحت اور تائید میں اس مثال کو نہ ہی پیش کرتے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔

میشود از بہرِ اغراضِ عمل ۔۔۔ عامل و معمول و اسباب و علل

خودی کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے کبھی عامل (SUBJECT) بن جاتی ہے، کبھی معمول (OBJECT) اور کبھی اسباب و علل (CAUSES) بن جاتی ہے۔

خیزد، انگیزد، پرد، تابد، رمد ۔۔۔ سوزد، افروزد، کشد، میرد، دمد

خودی اپنے تخلیقی پروگرام کی خاطر مختلف انداز اختیار کرتی اور گوناگوں عوامل و عناصر بناتی چلی جاتی ہے۔ اٹھتی ہے۔ بھڑکتی ہے۔ چمکتی ہے۔ دوڑتی ہے۔ جلتی ہے۔ جلاتی ہے۔ مارتی ہے۔ مرتی ہے۔ جلوہ افروز ہوتی ہے۔ غرضیکہ ہر لحظہ وہ ایک نئی شان اور نئی آن میں ہوتی ہے۔ اور اس طرح وہ پیہم تغیرات سے اپنے تخلیقی پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

ان دو اشعار میں اگرچہ علامہ اقبال نے یہ سب کچھ خودی کے متعلق کہا ہے۔ لیکن جو لوگ "ہمہ اوست" کے قائل ہیں اور اقبال کے ہاں سے بھی اس تصور کی تائیدات تلاش کرتے رہتے ہیں یہ اور اسی قسم کے اور اشعار انہیں اسی قسم کی تائیدات بہم پہونچانے میں مدد دیتے ہیں۔ اگرچہ اقبال کے نزدیک خودی وہ توانائی ہے جو رگِ کائنات میں لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ لیکن اس تصور کے قائل خودی کو خدا سے الگ نہیں کرتے اور اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ علامہ اقبال کے نزدیک یہ تمام کیفیات و ماجریات (جس کو انھوں نے خودی کی طرف منسوب کیا ہے) خود خدا ہی کی شئون ہیں۔ درحقیقت یہ شاعری کی جولانیاں ہیں۔ اگر علامہ اقبال ان حقائق کو نثر میں بیان کرتے تو وہ متعین طور پر کہتے کہ ان کا مفہوم و منطوق کیا ہے۔ اور اس سے پھر الگ الگ مفہوم نکالنے کا امکان نہ رہتا۔

خودی درحقیقت ایک تناؤ کی حالت (STATE OF TENSION) کا نام ہے اور اس کا بقا بھی اسی حالت یا کیفیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ یعنی اگر یہ تناؤ (TENSION) مٹ جائے یا اس میں ضعف آجائے تو پھر خودی باقی نہیں رہتی۔ اور اگر اس تناؤ کی کیفیت بڑھتی چلی جائے تو خودی حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ (TENSION) کا لفظ سائیکلوجی کی اصطلاح ہے اور اس کا استعمال اس لفظ کے عام معنوں میں نہیں ہوتا۔ اس کا مفہوم نبی اکرمؐ کے ایک ارشاد گرامی سے واضح ہو سکیگا۔ آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو وہ اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ یعنی وہ ہر اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت مستعد ہو جو زندگی کے مقابل آئے اور اسے للکارے۔ اس کے بعد وہ خودی کے متعلق لکھتے ہیں۔

وسعتِ ایام جولانگاہِ او ۔۔۔ آسماں موجے ز گردِ راہِ او

زمانے (TIME) کی یہ لا انتہا وسعتیں خودی ہی کی جولانگاہ ہیں۔ اور اس کی بلندیوں اور پہنائیوں کا یہ عالم ہے کہ جسے ہم آسمان کہتے ہیں۔ وہ اس کی گرد راہ کی ایک لہر ہے۔

گل بہ جیب آفاق از گلکاریش ۔۔۔ شب ز خوابش روز از بیداریش

یہ خودی ہی کی گلکاریوں اور نقوش انگاریوں کا اثر ہے کہ صحنِ کائنات، دامانِ باغبان و کفِ گلفروش نظر آتا ہے جسے ہم رات کہتے ہیں۔ وہ خودی کی نیند ہے۔ جو ہمیں دن نظر آتا ہے۔ وہ اس کی بیداری ہے۔ اس کے جاگنے سے سارا عالم جاگ اٹھتا ہے۔ اس کے سونے سے ساری کائنات پر نیند کی غنودگی اور رات کی تاریکی چھا جاتی ہے

فردوسِ گم گشتہ

از: پرویز

ان مضامین کا مجموعہ جنھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف

صفحات ۴۱۶

قیمت:۔ چھ روپے۔

عورت کا قرآن

(۲۳)

مطلب یہ ہے کہ جب کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کو تہ تیغ کرو، یہاں تک کہ جب ان میں مقابلے کی طاقت نہ رہے اور ان کا زور ٹوٹ جائے تو پھر بقیۃ السیف کو گرفتار کرلو۔ سارے قرآن میں صرف ایک یہی آیت اسیران جنگ کے سلسلہ میں ہے۔ جس کا یہ پہلا ٹکڑا پیش کیا گیا ہے۔ اور جس پر "غلامی" کا جواز قیامت تک کے لئے ثابت کیا جاتا ہے۔ مگر اسی آیت کا اور بعد ہی کا دوسرا ٹکڑا یہ ہے:-

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً

پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر

یعنی جو لوگ گرفتار ہوں ان کو، اگر وہ فدیہ دیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دو اور اگر فدیہ نہ بھی ادا کریں یا نہ ادا کر سکیں تو ان کو احسان رکھ کر چھوڑ دو۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو مشورہ نہیں، تاکیدی حکم دیا ہے کہ احسان کرو۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (نحل ۱۳)

بے شک اللہ تم کو عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے:

اب ذرا اس حکم کی روشنی میں اسیران جنگ کے ساتھ سلوک کے حکم پر غور کیجئے۔ بقول طلوع اسلام (جون ۱۹۵۳ء):-

اس حکم کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اس میں کہیں کسی پہلو سے بھی انہیں غلام بنائے رکھنے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے یا اس قسم کا گمان بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ اسیران جنگ کو غلام بنائے رکھو! ان کی عورتوں سے جنسی تمتع کرو! پھر جی چاہے تو انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کردو! فروخت ہونے کے بعد وہ نئے خریدار کے غلام بن جائیں اور لونڈیاں ان کے مصرف میں آنے لگ جائیں!"

مالک رام کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" پر تنقید کے سلسلے میں مولانا حافظ اسلم جیراجپوری رسالہ آجکل (دہلی) کے جولائی فروری ۱۹۵۵ء میں "غلامی" کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

ملک یمین کے مسائل جو قرآن میں ہیں۔ وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کی بابت ہیں جو اس حکم کے نزول سے پہلے عربوں کے ہاتھوں میں موجود تھے اسی لئے قرآن نے جہاں جہاں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ بصیغہ "ماضی" یعنی "ما ملکت" کیا ہے۔ نہ کہ بصیغہ "مضارع" کیونکہ آئندہ کے لئے ان کی آمد کا راستہ ہی بند کر دیا ہے۔ یہ ملک یمین یعنی لونڈی، غلام اس وقت عربوں کی معاشی زندگی میں اس قدر دخیل تھے کہ اگر قرآن ایک دم ان کو آزادی کا پروانہ دے دیتا تو نہ صرف آقاؤں بلکہ اکثر حالتوں میں خود ان غلاموں کو بھی مصیبت کا سامنا ہوتا اور قوم کی اقتصادی حالت میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ اس لئے قرآن نے جس کا طریقہ تدریجی اصلاح ہے، رفتہ رفتہ ان کی آزادی وگلو خلاصی کا سامان کیا۔ قتل خطاء، نقض یمین اور ظہار وغیرہ کا کفارہ یہی رکھا کہ غلام آزاد کرو۔ نیز عام نعمتوں کے شکریہ اور گناہوں سے استغفار میں بردہ (غلام) آزاد کرنے کی رغبت دلائی۔ اگر خود کوئی غلام اپنی آزادی خریدنا چاہے تو حکم دیا کہ اس کو آزادی کا پروانہ لکھدو۔ اور اس کی قیمت کی ادائیگی میں اپنے پاس سے مالی امداد بھی دو۔ ان سب کا مقصد یہ تھا کہ بلا کسی جبر کے خود مالکوں کی خوشی سے غلام اور لونڈی آزاد ہو جائیں۔ اور ملت اسلامیہ سے غلامی کی لعنت دور ہو جائے۔ لیکن سلاطین اور امراء اور علماء فقہا نے اس کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ آج جب کہ سارے کفرستانوں میں "غلامی" ناجائز قرار پا چکی ہے۔ اسلام کے مرکز "مکہ مکرمہ" میں بردہ فروشی کی دکان موجود ہے اور اسلامی ممالک سوڈان وغیرہ میں اس کے تجارتی اڈے ہیں:

مولانا اسلم کو اسلامی ممالک میں "غلامی" کے جاری وساری رہنے کا شکوہ ہے۔ جس کے جواز کے لئے ان ممالک کے سامنے فقہا اور علماء کا فتویٰ موجود ہے، وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ اسلامی ممالک کے باشندے ہر قرآنی قید و بند سے آزاد ہیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی ۱۹۴۹ء میں حج کو گئے تھے۔ رمضان میں ان کا قیام بغداد میں تھا۔ ان کی ڈائری "دیار عرب میں" کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

یکم رمضان ۱۳۶۸ھ ۲۷ جون ۱۹۴۹ء روز دوشنبہ

"آج رمضان ہے۔ کھانے کی اکثر دکانیں قانوناً بند ہیں۔ ریڈیو سے قرآن خوانی ہوتی ہی رہتی ہے۔ آج سے اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مگر...... بسر بازار شربت نوشی اور سگریٹ نوشی کا دور چلتا ہے۔ کسی قسم کی مطلق جھجک نہیں۔ ہر جگہ ایک حالت ہے، ممکن ہے یہاں بے راہ روی اور جگہوں سے زیادہ ہی ہو"

دو نئے بلند پایہ اسلامی تاریخی ناول

مرگ یزید

از:- خالد پرویز

چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی ازل سے برسر پیکار ہیں، یزدان واہرمن، ابراہیم و نمرود موسیٰ و فرعون ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں، حادثہ کربلا بھی مظلومیٔ حق کی ایک ایسی ہی درد انگیز مثال ہے۔ مگر ہم واقعہ کربلا سے اتنے واقف نہیں، جتنے حضرت امام حسین علیہ السلام کی مظلومیت سے آگاہ ہیں۔ ہمیں ان تاریک قوتوں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں جو اسلام کو برباد کرنے پر تل گئی تھیں اور جن کی نمائندگی یزید کرتا تھا۔

ہم یہ نہیں جانتے کہ یزید جس کے عہد میں کربلا کا خونیں واقعہ پیش آیا۔ اور تاریخ اسلام کے صفحات پر خون شہادت کی مقدس مہر ثبت ہوئی۔ وہ کون تھا۔ خود اس یزید کی موت کیسے ہوئی۔ کربلا کے خونیں حوادث سے پہلے اور مابعد کیا ہوا؟ یہ دردناک داستان بیک وقت ناول بھی ہے، تاریخ بھی ہے اور ایک سوانحعمری بھی

صفحات ۴۴۸، مجلد رنگین گردپوش۔ قیمت پانچ روپیہ بارہ آنے

خلیفہ عبدالرحمن الناصر

سید ظہور احمد ندوی

وہ جواں ہمت مجاہد جس نے یورپ کے قصر شاہی میں لرزہ ڈال دیا جس کی تیغ جوہر دار کا لوہا مان کر اندلس کی پہنائیاں سمٹ جاتی تھیں اور جس کی ہیبت سے شہنشاہ فرانس کا محل تھرتھرانے لگتا تھا۔ اندلس میں اسلامی حکومت کی پرشوکت اور شاندار زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ صفحات ۴۱۲، مجلد رنگین گردپوش۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

نفیس اکیڈیمی بلاسس اسٹریٹ کراچی

۱؎ مولانا مسعود عالم ندوی اپنی ڈائری "دیار عرب میں" کے صفحہ ۳۰ پر لکھتے ہیں۔ "ابن سعود کی بیویاں تو چار ہی ہیں مگر لونڈیوں کی تعداد اللہ کو معلوم۔ اسی طرح ولی عہد بہادر بھی چار بیویوں پر قانع نہیں، ان کے یہاں بھی لونڈیاں ہیں علماء نجد نے لونڈیوں کے جواز کا فتویٰ دے رکھا ہے۔

پاکستان ــــ غیروں کی نظر میں

لندن کے مشہور ہفتہ وار جریدہ "اکانومسٹ" نے اپنی ۱۳ راگست کی اشاعت میں پاکستان کی تازہ دلولہ سفر کے عنوان سے پاکستانی سیاست پر ایک بسیط تبصرہ کیا ہے جسے ہم بلا تائید و تردید کے بغیر علیٰ حالہٖ شائع کرتے ہیں:۔

کل ۱۴ راگست کو اہل پاکستان اپنی قومیت کی آٹھویں سالگرہ منا رہے ہیں ہر چند اس تقریب سے ایک ہفتہ پہلے مبہم اور پریشان سیاسی سرگرمیوں کا اچانک سلسلہ شروع ہو گیا، تاہم افق پر نئی امیدیں بھی ابھرتی نظر آتی ہیں۔ پاکستان ابھی تک نشیب و فراز راہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا لیکن اس کے سفر کے آسان تر ہونے کے امکانات بڑے روشن ہو گئے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ وہ موڑ مڑ چکا ہے جہاں سے یہ تباہی کی طرف بھی جا سکتا تھا۔ چند ہی ہفتہ پیشتر پاکستان میں پارلیمانی طرز سیاست کا خاتمہ بالکل قریب دکھائی دیتا تھا۔ پچھلے جیسے یہ حالت تھی کہ فوجی اور سول حکام جنھوں نے مملکت کو استوار و متوازن بنانے میں حقیقی کام کیا ہے اور جنھوں نے مداخلت کرکے احزابی سیاست دانوں کا ہاتھ روکا اور ان کے ہاتھوں ملک کو دوضعیت کا شکار ہونے سے بچایا، یوں محسوس کر رہے تھے گویا ایک دفعہ پھر اس سارے گند کا پوری طرح صفایا کرنا ہوگا باوجودیکہ تا دم تحریر نئی وزارت کی تشکیل نہیں ہوئی یہ آثار پیدا ہو گئے ہیں کہ حکومت کو اس قسم کے اقدام کی ضرورت در پیش نہیں آئیگی۔ اب فضا ایک نئی حقیقت پسندی سے ہموار ہو رہی ہے۔

اگر اب پاکستان اپنی راہ ہموار کرنے اور اسے ہموار رکھے تو اس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہونگے۔ یہ پاکستان ہی کے حق میں مفید نہیں ہوگا بلکہ اس سے ان تینوں اقوام کے گروہوں کو فائدہ پہنچے گا جن پر پاکستان اپنا اثر ڈال سکتا ہے یہ تین گروہ ہیں دولت مشترکہ، عالم اسلامی اور کولمبو حلقہ اقوام۔ پاکستان اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں سے بے خبر نہیں۔ اس کی سیٹو میں شمولیت ترکی اور عراق سے روابط اور بنڈونگ کانفرنس میں اس کا کردار اس پر شاہد ہیں کہ اسے ان کا پورا شعور حاصل ہے: یہ درست ہے لیکن بیرونی دنیا کو ابھی یہ شبہ ہے کہ پاکستان اپنا کردار بطریق احسن پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔ کئی پاکستانی بھی اس شبہ سے محفوظ نہیں۔

۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کے صبر آزما سالوں میں پاکستان جن گوناگوں بحرانوں سے دوچار رہا ان سے عام مایوسی پیدا ہو گئی۔ معاشی بحران سے تو بصد مشکل چھٹکارا حاصل کر لیا گیا لیکن سیاست میں یاس اور بددلی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آسرے بنتے تھے اور بن بنکر ٹوٹتے تھے۔ امیدیں ابھرتی تھیں اور ابھر ابھر کر دم توڑتی تھیں۔ غرضیکہ ایک عجیب کشمکش اور بیم و رجا کا عالم تھا۔ سابقہ مجلس دستور ساز جسے بیسویں صدی کی "طولانی پارلیمان" کہنا چاہئے حقائق سے دور سے دور تر ہوتی گئی اور رائے عامہ سے اس کا کوئی علاقہ نہ رہا۔ وہ غیر نمائندہ ہی نہیں تھی، ملکیتی قبضویت کی طرح بھی قائل رہی تھی۔ جب اس نے اپنے آپ کو دوام دینا چاہا تو اسے ختم کر دینا پڑا۔ مسلم لیگ، یعنی پاکستان کی بانی جماعت، اپنے مقصد سے یکسر غافل ہو گئی، اس کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کی شہرت زائل ہو گئی۔ مغربی پاکستان میں صوبائی اور ریاستی سیاست ہوس جاہ کا اکھاڑہ بن گئی اس کے برعکس مشرق میں بنگالی علیحدگی کا جذبہ پیدا ہو گیا جسے کراچی کے تغافل اور بے عملی نے فروغ دیا اس سے ملک دوگونہ عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف از حد شخصی سیاست کی دسیسہ کاریاں تھیں اور دوسری طرف مملکت کے مذہبی ہونے کی ملایانہ موشگافیاں ملک کا اللہ ہی مالک تھا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صعوبات راہ داستان ماضی بن گئی ہیں۔ تاہم نئی حقیقت پسندی ان میں سے بعض کا تو قلع قمع کر دے گی اور بعض کو یوں محدود کر دے گی کہ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان ہو جائیگا۔ نئی اور زیادہ نمائندہ مجلس دستور ساز تشکیل پذیر ہو چکی ہے اور پبلک بے صبری سے انتظار کر رہی ہے کہ جو ترمیم یافتہ مسودہ آئین اس کے پیش نظر ہے اس کا فیصلہ کرے۔ اس مسودہ کی رو سے مغرب کے چار صوبوں اور نو ریاستوں کو ملا کر ایک وحدت بنا دیا جائیگا۔ اس سے چھوٹی چھوٹی حد بندیاں اور ان سے پیدا شدہ انتظامی گرانباریاں اور فساد ختم ہو جائیں گے۔

نئے صوبے کی ہیئت کا خاکہ تیار کر لیا گیا ہے۔ اور بھی سب کچھ تیار ہے۔ ادغام اس صفائی سے کیا جا رہا ہے کہ اس سے جن ارباب سیاست سے مسانید اقتدار چھن جائیں گی وہ بھی اس کی مخالفت کے لئے گنجائش نہیں نکال سکے۔ نئی انتظامی مشینری مقامی حکام کے ہاتھ یوں مضبوط کر دے گی کہ اس سے صلاحیت کار بڑھے گی اور ملک میں اطمینان پھیلے گا۔

مسلم لیگ، جو ملک میں تو کافی حد تک اعتماد کھو بیٹھی تھی۔ لیکن مجلس دستور ساز میں بدستور سیاہ سپید کی مالک تھی، اب صحیح پوزیشن پر آگئی ہے۔ اس ہفتہ میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مسلم لیگ کا باغی مسٹر سہروردی، امور سیاسی میں مرکزی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان کی پشت پر منظم جماعت عوامی لیگ ہے اور انھیں بااثر "آزادوں"، شائد پنجاب کے ملک فیروز خاں نون کی تائید بھی حاصل ہے سرکاری حکام بھی ان کی قابلیت کا لوہا مانتے ہیں۔ وزیر قانون کی حیثیت سے مسٹر سہروردی نے آئین کی نگرانی کی ہے اور وحدت مغربی کا خاکہ تیار کیا ہے۔ ان کو اس وقت حکومت سے نکال کر مخالف بنا لینا بڑے نقصان کا باعث ہوگا۔ مسٹر محمد علی کا زوال عجیب انعام ہے ان خدمات کا جو انھوں نے ملک کے لئے بین الاقوامی میدان میں سرانجام دیں۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ امریکہ نے ان صبر آزما سالوں میں پاکستان کو مدد دی۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ مسٹر محمد علی کی سیاسی چالوں نے ملکی سیاست میں پراگندگی پھیلا دی، ان کا استعفا حقیقت پسندی کا ایک اور ثبوت ہے عوام اور ارباب سیاست میں ان کا کوئی قابل ذکر پیروکار نہیں رہا تھا مزید براں ان کا استعفا اور مسلم لیگ کی شاخ تراشی نے چودھری محمد علی جیسی واجب الاحترام شخصیت کی وزارت عظمیٰ کا راستہ صاف کر دیا۔ چودھری صاحب نے وزیر خزانہ کی حیثیت سے قومی محاصلات کو متوازن رکھا ہے۔ انھوں نے حال ہی میں ایک ضرب کاری سے۔ جو کتنی ہی متاخر کیوں نہ ہو۔ پاکستانی روپے کو قدر زائد سے نجات دلا دی ہے۔

یہ چودھری صاحب ہی کی ہنرمندانہ مساعی کی برکت ہے کہ بساط سیاست پر سائے لباس حقیقت پہنتے جا رہے ہیں اور ملک کی معاشی اساس استوار ہو گئی ہے۔ اب قحط کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ کیونکہ اناج کے قابل قدر ذخیرے قائم کئے جا چکے ہیں اگر جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے، پنجاب کے دریائی پانی کی تقسیم کا عارضی سمجھوتہ مستقل ہو گیا اور ہندوستان سے نزاع کا خاتمہ ہو گیا تو اس سلسلہ میں بے یقینی کا ایک اور عنصر دور ہو جائے گا۔ روپے کی قیمت میں کمی کر کے اسے ہندوستانی روپے کے برابر کر دینا ایک عرصہ سے ناگزیر نظر آرہا تھا لیکن اس بجٹ کے شروع میں یہ اقدام بڑی چابکدستی سے کیا گیا۔ معاشی اعتماد جو اس اقدام کا نتیجہ بلکہ پہلا پھل ہونا چاہئے پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ قدرتی گیس سوئی (بلوچستان) سے مہیا ہونا شروع ہو گئی ہے اس سے ایندھن کی دشواری بھی کم ہو رہی ہے اور باہر سے ایندھن کی درآمد کا خرچ بھی کم ہو رہا ہے۔ اب جو صنعتی ترقی ہو رہی ہے جس کی منصوبہ بندی۔ ایک حد تک سوئی گیس کی اساس پر ہو رہی ہے ایک مناسب شکل اختیار کر رہی ہے جو معقولیت اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ مثلاً کپڑے کی بعض اقسام کے سلسلہ میں برآمد بڑھانے کا جوڑ نہیں کھیلا جا رہا بلکہ خود کفالتی کا مقصد پورا کیا جا رہا ہے۔ اب پاکستان کوریا کی جنگ سے پیدا شدہ فراوانی کا خواب نہیں دیکھ سکتا لیکن وہ برآمد سے زیادہ آمدنی اور زیادہ محصولات ضرور پیدا کر سکتا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سیاست یا معاشیات میں سستانے کا وقت آپہنچا ہے۔ پاکستان قدرتی طور پر امیر ملک نہیں اور ابھی اس کے پاس اعلیٰ فنی ماہرین اور منتظمین کی بھی از حد کمی ہے۔ اس کے جغرافیائی طور پر علیحدہ حصوں کو آئین کا ماہر سے ماہر بھی ہاتھ کی صفائی سے ملا نہیں سکتا۔ اسی طرح بنگالی، پنجابی، پٹھان اور سندھی کے مابین خلیج افتراق کو انتہائی قابل انتظامیہ سے بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن چند ایسے افراد موجود ہیں جن کی نگاہ کا افق بین الصوبائی نزاعات سے بلند تر ہے۔ ان میں مسلمہ دیانت اور اہلیت کے مالک بھی ہیں۔ ان میں سے نمایاں چودھری محمد علی ہیں۔ ان کی وجہ سے حکومت اور پارٹی میں فاصلہ ایک حد

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

ناقابل فراموش حقیقتیں

حضرت عمرؓ کا مکتوب گرامی حضرت ابو عبیدہ بن جراح کے نام

بسم الرحمٰن الرحیم

عبداللہ عمر امیر المومنین کی طرف سے امین الامۃ (ابو عبیدہ) کو سلام علیک۔

تم کو معلوم ہو کہ جبلہ بن ایہم غسانی اپنے چچا زاد بھائیوں اور خاندانی اکابر کے ساتھ ہمارے پاس آیا تھا۔ میں نے ان کی آؤ بھگت کی سب نے میرے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، ان کے اسلام سے مجھے خوشی ہوئی، کیونکہ ان کے ذریعہ اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کو قوت عطا کی، مگر پردۂ غیب میں جو چھپا تھا اس کا حال مجھکو معلوم نہ تھا۔ ہم حج کے لئے مکہ گئے، جبلہ نے بیت الحرام کے سات طواف کئے دوران طواف میں اسکا ازار ایک فزاری عرب کے پیر تلے آ گیا اور ازار کھل کر کندھے سے گر پڑا۔ جبلہ نے بڑھکر فزاری کو دیکھا اور کہا:- تیرا برا ہو تو نے خدا کے حرم میں مجھے ننگا کر دیا۔ فزاری نے کہا خدا کی قسم میں نے قصداً ایسا نہیں کیا۔ تاہم جبلہ نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی ناک زخمی ہو گئی اور اسکے اگلے چار دانت ٹوٹ گئے۔ فزاری میرے پاس فریاد لیکر آیا، میں نے جبلہ کو بلوایا اور کہا کہ تم نے اپنے فزاری بھائی کے کیوں تھپڑ مارا اور اس کے اگلے چار دانت توڑ دیئے اور اس کی ناک زخمی کر دی؟ جبلہ نے کہا اس نے پیر کے نیچے میری ازار دبا کر کھول دی، خدا کی قسم اگر بیت اللہ کی حرمت کا مجھے خیال نہ ہوتا تو اس کو مار ڈالتا؟ میں نے کہا کہ تم نے جرم کا اقبال کیا ہے۔ اب یا تو وہ تم کو معاف کر دے یا میں اس کا تم سے قصاص لونگا۔ جبلہ نے کہا۔ مجھ سے قصاص لیا جائیگا۔ حالانکہ میں بادشاہ ہوں اور وہ ایک معمولی عرب ہے!" میں نے کہا۔ تم دونوں مسلمان ہو۔ میں تمہارے اور اس کے درمیان اسلامی قانون کے بموجب فیصلہ کروں گا۔ جبلہ نے مجھ سے اگلے دن تک مہلت مانگی اس نے مہلت کیلئے فزاری کو بھی تیار کر لیا۔ جب رات ہوئی تو وہ اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ اونٹوں پر سوار ہو کر شام کی طرف نکل گیا۔ الطاغیہ (رومی قیصر) کے پاس نکل بھاگا، مجھے امید ہے کہ خدا نے چاہا تو وہ تمہارے ہاتھ آئے گا۔

والسلام علیک وعلی جمیع المسلمین۔ (فتوح الشام)

مزید ارشادات

(۱) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ اپنے گورنروں کو ہدایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ کسی پر کوئی سختی نہ کریں اور نہ لوگوں کا مال غصب کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"تم میں سے جس کے ساتھ حکومت کے آدمی ناجائز سختی کو پیش آئیں ان کا مقدمہ میرے پاس پیش کیا جائے۔ میں ان سے باز پرس کروں گا اور اسے اسکی سختی کا مزہ چکھاؤں گا"

آپ کے اس خطاب کو سنکر حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا

کیا آپ ایسے شخص سے بدلہ اور قصاص لیں گے جو رعایا کو ادب سکھائے۔

آپ نے یہ سنکر فرمایا

ہاں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے، میں یقیناً اس سے بدلہ لونگا۔ اور کیسے نہ لوں جبکہ میں نے خود آنحضرتؐ کو اپنے آپ سے بدلہ لیتے دیکھا ہے۔

(۲) دوسرا ارشاد

اگر کسی حاکم کے ذمے یہ فریضہ ہو کہ وہ کسی اہم شعبہ کے لئے کسی ذمہ دار آدمی کا انتخاب کرے۔ اور وہ اس کے لئے کسی آدمی کو اس بنا پر منتخب کرے کہ اس سے اس کی رشتہ داری یا دوستی تھی۔ تو اس نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی۔

(۳) حضرت عمرؓ جب عاملوں کو بھیجتے تو یہ زریں ہدایت فرماتے

ان لا ترکبوا برزونا ولا تاکلوا نقیا ولا تلبسوا رقیقا ولا تغلقوا ابوابکم دون حوائج الناس فان فعلتم شیئا من ذالک فقد حلت بکم العقوبۃ

(مشکوٰۃ کتاب الامارۃ)

عمدہ گھوڑے پر نہ سوار ہونا، اور نہ میدہ کھانا، نہ باریک کپڑا استعمال کرنا، اور نہ ضرورت مندوں پر اپنا دروازہ بند کرنا، اگر تم نے ان میں سے کوئی بات کی، تو تم پر عقوبت اور سزا نازل ہوگی۔

(۴) جنگ قادسیہ کے موقع پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بحیثیت سفیر رستم کی فرودگاہ میں پہنچے تو رستم نے اسلامی سفیر کو مرعوب کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا کہ خود بیچ دربار میں ایک سونے کے تخت پر جواہرات کا تاج سر پر رکھ کر بیٹھ گیا، اور یہاں سے وہاں تک دو رویہ زرنگار پردے لٹکائے، ریشم کے نفیس فرش بچھوائے، درباریوں کو بیچ دیکر ادھر ادھر بٹھا دیا، اور خدام کو دو رویہ کھڑا کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی اس ظاہری نمائش سے کب مرعوب ہوتا، حضرت مغیرہؓ گھوڑے سے اتر کر سیدھے رستم کے پاس پہنچ گئے اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے، ان کی اس جرأت پر سارا دربار حیرت زدہ رہ گیا، اور شاہی آداب کے خلاف سمجھا، چنانچہ ایک آدمی بڑھا اور مغیرہؓ کو تخت سے اتار دیا، یہ دیکھکر حضرت مغیرہؓ نے برجستہ فرمایا

"اے سرداران ایران! ہم تو تم کو عقل مند سمجھتے تھے لیکن تم بڑے بیوقوف نکلے، ہم مسلمان بندوں کو خدا نہیں بنایا کرتے اور کمزور انسانوں پر طاقت ور لوگوں کی آقائی کے قائل نہیں، ہمارا خیال تھا کہ تمہارے ہاں بھی یہی دستور ہوگا، بہتر یہ تھا کہ تم ہمیں پہلے ہی بتا دیتے کہ تمہارے یہاں کمزور طاقت ور کی پرستش کرتے ہیں اور انھیں دیوتا بنا کر اونچی جگہ بٹھاتے ہیں، انسانی مساوات کا اصول تمہیں تسلیم نہیں، اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی تو میں ہرگز تمہارے دربار میں نہیں آتا، خیر اب تو میں آ گیا لیکن تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ سلطنت قائم رہنے کے یہ ڈھنگ نہیں، زیردستوں کی بے قراری تمہارے اقتدار کی بساط الٹ دے گی۔"

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نظریہ حاکم و محکوم کے بارے میں کیا ہے، اور اسلام حکومت کے فرماں رواؤں کو کس ڈھنگ سے زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے۔

(۵) ابو مسلم خولانی حضرت معاویہ بن ابو سفیانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا

السلام علیک ایھا الاجیر (اے مزدور تم پر سلامتی ہو)

لوگوں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہتے ہیں، یوں کہئے "السلام علیک ایھا الامیر" یہ سن کر ابو مسلم خولانی نے پھر دہرایا "السلام علیک ایھا الاجیر"

لوگ بار بار اصرار کرتے رہے کہ "ایھا الامیر" سے خطاب کیجئے، مگر یہ ہمیشہ "ایھا الاجیر" ہی سے خطاب کرتے رہے، حضرت معاویہؓ جو اس ردوکد کو سن رہے تھے فرمایا "ان کو چھوڑ دو جو کچھ کہتے ہیں اسے اچھی طرح جانتے ہیں" ابو مسلم خولانی نے تشریح فرمائی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے فرمایا۔

"آپ مزدور ہیں، ان بکریوں (مخلوق) کے رب نے آپ کو ان کی حفاظت کے لئے اجرت پر مقرر کیا ہے، اگر آپ نے ان بکریوں کے مرض کی دیکھ بھال کی اور جو بیمار رہیں ان کا دوا علاج کیا اور ان میں سے ایک کی زیادتی کرنے کو دوسرے پر روکا، تو ان بکریوں (مخلوق) کا مالک آپ کو پورا پورا اجر عطا کرے گا اور اگر آپ نے ان باتوں میں سے کوئی ذمہ داری نہ ادا کی تو مالک سزا دے گا۔"

علاج

ہر قسم کی پرانی اور پیچیدہ بیماریوں خاص کر تپ دق اور پیچش سے نجات کیلئے ہم سے رجوع کریں۔

اوقات مطب

شام ۵ بجے سے ۸ بجے تک۔

نوٹ:- غریبوں کو دوائی مفت۔

کوثر دواخانہ۔ آگرہ تاج کالونی کراچی

وہ اندھا جس نے پوری قوم کو آنکھیں دیں

شاہ فاروق کی علیحدگی کے بعد جنرل نجیب نے قاہرہ میں اپنے ان فوجی افسروں کا ایک اجتماع کیا جنھوں نے اس انقلاب کی کامیابی کے لئے اس کی مدد کی تھی۔ اس میں اس نے اپنے فوجی رفقاء کے علاوہ ایک غیر فوجی کو بھی مدعو کیا۔ یہ تھا طٰہٰ حسین۔ ۶۴ سالہ مصنف اور ماہر تعلیم۔ نجیب نے طٰہٰ سے کہا کہ وہ اس اجتماع سے خطاب کرے۔ یہ بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھا اور مجمع سے کہا کہ

محض ڈسپلین اور نظم و ضبط کافی نہیں۔ وہ حکومت جو نظم و ضبط تو قائم کرے لیکن آزادی کو ختم کر دے وہ ایسی ہی کی طرح ہے آج جو روس میں فولادی پردے کے پیچھے ہیں۔ جہاں ایک انسانی فرد کو چیونٹی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر حسین اس نقطہ کو واضح کرتا چلا گیا اور جب اس نے اپنی تقریر کو ختم کیا تو کمرہ میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ فوجی افسر ایسے بھی تھے جنھوں نے ان خیالات کو چنداں وقعت نہیں دی لیکن جنرل نجیب اٹھا اور طٰہٰ حسین کو گلے سے لگا لیا اور اپنے رفقاء کی طرف دیکھ کر کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب طٰہٰ حسین کے ان الفاظ کو اپنے دلوں میں جگہ دیں۔ یہ الفاظ ہماری تحریک کا سنگ بنیاد ہیں۔

طٰہٰ حسین مشرق وسطیٰ میں گذشتہ تیس سال سے جہالت اور استبداد کے خلاف مصروف جدوجہد ہے۔ مصر سے ملوکیت کو ختم کرنے میں اس کی کوششیں کسی دوسرے سے کم نہیں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے ملک میں تقریر و تحریر کی آزادی کی قدر و قیمت کو ایک ایک سے منوا لیا ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر اس کا معرکۃ الآرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ مصر کے ایک ایک بچہ کی مفت تعلیم کا انتظام کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو کسی دوسرے عرب ملک کو ابھی تک نصیب نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر حسین نے یہ سب کچھ ایک ایسے سانحہ کی موجودگی میں کیا ہے جو دوسروں کو خود اپنی روٹی کے لئے بھی غیروں کا محتاج بنا دیا کرتا ہے۔ وہ تین برس کا بچہ تھا کہ بالکل اندھا ہو گیا اور اس وقت سے آج تک بینائی سے محروم ہے۔ لیکن اس نے عمر بھر اس بات کو تسلیم ہی نہیں کیا کہ بینائی سے محرومی انسان کے راستہ میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے۔ ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ جب اس کے ایک دوست نے اس سے کہا کہ بینائی کا نہ ہونا آپ کے راستہ میں کتنی بڑی رکاوٹ ہے تو طٰہٰ حسین نے مسکرا کر کہا کہ آپ اسے رکاوٹ کہتے ہیں اور میں تو اسے ایک نعمت تصور کرتا ہوں۔ کتنی بے معنی اور غیر مفید سی باتیں ہیں جو آنکھوں کے ہونے کی وجہ سے میرے ذہن کو اپنی طرف کھینچ ہی نہیں سکتیں۔

نحیف جسم، متوسط قد، پاکیزہ خط و خال۔ سفید بال۔ شستہ مغربی لباس۔ سیاہ چشمہ۔ یہ ہے ڈاکٹر طٰہٰ حسین جس کے قریب جانے سے فوراً اجنبیت ختم ہو جاتی ہے اور چند ہی لمحوں میں اس کے قہقہے فضا میں گلفشانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

طٰہٰ حسین ایک غریب کسان کا لڑکا تھا جس کے تیرہ بچے تھے وہ شمالی مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہ ابھی تین ہی سال کا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے بھائی بہن جن چیزوں کا ذکر کرتے ہیں وہ اسے دکھائی نہیں دیتیں۔ یعنی تین برس کی عمر میں اس کی بینائی جاتی رہی۔ اور یہ چیز صرف طٰہٰ حسین کے ساتھ ہی واقع نہیں ہوئی۔ مصری دیہاتی آبادی کے قریب پچاس فیصدی بچوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ لیکن طٰہٰ حسین نے سڑک پر بھیک مانگنے کے بجائے مکتب کا رخ کیا۔ تھوڑے سے عرصہ میں اس نے قرآن حفظ کر لیا اور جو کچھ مکتب میں پڑھایا گیا اس میں یہ اپنے ہم سبق بچوں میں سب سے آگے تھا۔ اس کی ذہانت کی بنا پر اسے مزید تعلیم کے لئے شہر میں بھیج دیا گیا جہاں اس نے جامعہ ازہر میں اپنی شاندار کامیابی کی بنا پر وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۱۴ء میں اس نے اسی یونیورسٹی سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ سب سے پہلی ڈگری تھی جو اس یونیورسٹی کی طرف سے کسی کو ملی تھی۔ اس کی بے مثال ذہانت اور فطانت کی بنا پر اسے پیرس بھیج دیا گیا جہاں اس نے پی ایچ ڈی کی ایک اور ڈگری حاصل کر لی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک فرخندہ جبین فرانسیسی بیوی بھی جس کے ساتھ اس نے ۱۹۱۸ء میں شادی کی۔

وطن میں واپسی پر وہ قاہرہ یونیورسٹی میں عربی ادب کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے پہلے ہی دن اپنے طالبعلموں کو یہ سبق دیا کہ وہ کسی معاملہ میں تقلید نہ کریں بلکہ ہر مسئلہ کا مطالعہ آزادانہ کریں۔ یہ تصور مصری فضا میں یکسر غیر مانوس اور ایک قسم کی بہت بڑی بدعت تھا۔ وہاں تو سکھایا یہ جاتا تھا کہ جو کچھ تمہیں اسلاف سے ملے اسے آنکھیں بند کر کے قبول کرتے چلے جاؤ اس لئے کہ ؏

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

حتیٰ کہ وہ توہم پرستانہ افسانے جن کے متعلق بادیٔ النظر میں معلوم ہو جائے کہ وہ محض ذہن انسانی کے تراشیدہ ہیں انھیں بھی ابدی حقیقت سمجھا جائے۔ طٰہٰ حسین نے اس باب میں ایک کتاب لکھی جس میں پوری پوری تحقیق کے بعد بتایا کہ اس قسم کے تمام معتقدات محض افسانے ہیں جنھیں اسلام سے کچھ تعلق نہیں اس کتاب نے وہی کیا کہ ہر ملا زدہ ملک میں ہونا چاہئے۔ مصر کی فضا میں ہیجان پیدا کر دیا اور طٰہٰ حسین کے خلاف اس قدر شور اٹھا کہ حکومت کو ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنا پڑا۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور دیانتداری پر مبنی ہے۔ لیکن اس کے باوجود پارلیمنٹ میں ایسا قدامت پسند طبقہ موجود تھا جو اس پر زور دیتا تھا کہ اس کتاب کو ضبط کیا جائے۔ اس مسئلہ نے پارلیمنٹ میں بھی طوفان برپا کر دیا وزارت کی طرف سے طٰہٰ حسین کی تائید ہوتی تھی لیکن مخالف طبقہ نے حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کر دی آخر الامر طٰہٰ حسین کو کامیابی ہوئی اور اس سے نہ صرف یہ کہ اس کی کتاب ضبط نہ ہوئی بلکہ مصر میں پہلی مرتبہ تحریر و تقریر و فکر کی آزادی کو تسلیم کیا گیا

۱۹۳۰ء میں طٰہٰ حسین قاہرہ یونیورسٹی کا ریکٹر منتخب ہوا۔ اس کی صاف گوئی اور حریت پسندی کی وجہ سے مصر کا وزیر اعظم اسماعیل صدقی اس کا سخت مخالف ہو گیا، اور اس سے کہا کہ یا تو وہ یونیورسٹی میں حکومت کے خلاف تنقید کو بند کر دے یا اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائے۔ طٰہٰ حسین نے بہتیرا چاہا کہ وزیر اعظم کو سمجھائے کہ وہ غلطی پر ہے لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی طٰہٰ حسین نے اپنی تنقید کو بدستور جاری رکھا اور یونیورسٹی کے معاملات میں حکومت کی دخل اندازی کے خلاف ہمیشہ احتجاج کرتا رہا۔ حکومت سے اس تصادم کی وجہ سے طٰہٰ حسین بڑی مشکلات میں پھنس گیا۔ ادھر اس کا ایک بچہ ایسا بیمار ہوا کہ اس کے پاس جو کچھ پونجی تھی وہ اس کے علاج میں صرف ہو گئی اور اسے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے قرض مانگنا پڑا۔ اس نے مسلسل تین سال تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں مختلف نوعیتوں کی جسمانی اور ذہنی جراحتیں برداشت کیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات فرشتہ اجل کے دبے پاؤں کی آہٹ کو بھی سنا لیکن اس سے نہ اس کے عزم میں فرق آیا نہ کام کی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی۔ اس تین سال کے عرصہ میں اس نے سات گراں بہا کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان میں سے بعض کتابیں مصر میں ضبط کر لی گئیں لیکن ان سے اس کی شہرت تمام مشرق وسطیٰ میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ آخر الامر ۱۹۳۳ء میں صدقی برطرف ہوا اور طٰہٰ حسین پھر اپنے عہدہ پر بحال کر دیا گیا اور اس کی بحالی کے ساتھ ہی مصر کی تمام درسگاہوں کو آزادی نصیب ہو گئی۔

اس تین سالہ صعوبات کے تجربہ نے طٰہٰ حسین پر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ جب تک قوم کے لوگوں میں تعلیم کو عام نہ کر دیا جائے انھیں صحیح جمہوریت نصیب نہیں ہو سکتی چنانچہ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ حکومت کو مجبور کرے گا کہ وہ ملک کے ہر ایک بچہ کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کرے۔ مفت تعلیم کا خیال آج کوئی انقلابی خیال تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن اس زمانہ کے مصر میں۔ اور ایک مصر ہی پر کیا موقوف ہے تمام عرب ممالک میں اس قسم کا خیال فی الواقع بہت بڑا انقلابی خیال تھا۔ مفت تعلیم تو ایک طرف، مصر میں ابھی کل تک یہ کیفیت تھی کہ حکومت پرائمری کے درجہ میں ایک بچہ سے بیس پونڈ سالانہ بطور فیس وصول کرتی تھی حالانکہ بیس پونڈ سالانہ وہاں کے کاشتکار کی سالانہ آمدنی کے برابر تھے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس فیس کے خلاف علم جہاد بلند کیا اس کی دلیل یہ تھی کہ علم ایسی جنس نہیں جسے منڈیوں میں فروخت کیا جائے۔ یہ سورج کی روشنی اور تازہ ہوا کی طرح فطرت کا عطیہ ہے جو ہر اس شخص کے لئے مفت کھلا ہونا چاہئے جو اسے حاصل کرنے کی تڑپ اپنے اندر رکھتا ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اس دلیل کا جواب یہ تھا کہ حکومت کے پاس اس قسم کی

عیاشی کے لئے روپیہ نہیں۔ لیکن اصل اعتراض اقتصادی نہیں تھا شاہ فاروق اور اس کے حواری اس خطرہ کو محسوس کرتے تھے کہ اگر ملک کے غریب لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تو وہ اپنی موجودہ حالت سے غیر مطمئن ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں طٰہٰ حسین کہتا تھا کہ اس غریب طبقہ کی جو حالت ہے اسے اپنی حالت سے غیر مطمئن ہونا چاہئیے۔ اگر وہ غیر مطمئن نہ ہوگا تو اس کی حالت کی اصلاح ہی نہ ہو سکیگی۔ شروع شروع میں طٰہٰ حسین کی سخت مخالفت ہوئی۔ نہ صرف حکومت کی طرف سے بلکہ پریس کی طرف سے بھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنے اس جہاد کو جاری رکھا۔ تا آنکہ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں پارلیمنٹ میں سب سے پہلی بار اس فیصلہ کا اعلان ہوا کہ آج سے ملک میں پرائمری تک کی تعلیم مفت دی جائے گی۔

لیکن طٰہٰ حسین اس سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ اس فیس کے بھی خلاف تھا جو حکومت کی طرف سے ثانوی مدارس میں وصول کی جاتی تھی۔ اس نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا تو حکومت نے کہا کہ وہ وزیر تعلیم کے ساتھ بطور مشیر کام کرے اور اس طرح دیکھے کہ اس کا پروگرام کس حد تک قابل عمل ہے۔ اس حیثیت میں ڈاکٹر حسین نے حکومت سے یہ منظور کرا لیا کہ بچوں کو دوپہر کا کھانا اور طبی امداد مفت ملا کرے۔ نیز اس نے اسکندریہ یونیورسٹی کی بھی بنیاد رکھی جس میں اسوقت قریباً آٹھ ہزار طالبعلم تعلیم پا رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں حکومت نے طٰہٰ حسین کی خدمت میں وزارت تعلیم کا عہدہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ میں اس پیش کش کو اس شرط پر قبول کر سکتا ہوں کہ مجھے اس کا پورا پورا اختیار دیا جائے کہ ملک کو جس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے میں اس تعلیم کو رائج کر سکوں۔ چونکہ اس وقت حکومت کو خطرہ تھا کہ اگر ڈاکٹر حسین کی تجویز کی مخالفت کی گئی تو اس سے بڑی بدنامی ہوگی اور اگر وہ کیبنٹ میں شامل ہو جائے تو اس سے خود کیبنٹ کا مقام بلند ہو جائیگا اس لئے حکومت نے اسکی اس شرط کو فوراً قبول کر لیا۔ ڈاکٹر حسین نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ثانوی تعلیم کو مفت کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بل پیش کر دیا کہ سترہ سال کی عمر تک ہر بچہ کو جبری تعلیم دی جائے۔ اس پر پھر ایک طوفان اٹھا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اتنے اسکول اور اتنے اساتذہ کہاں سے آئیں گے۔ حسین نے کہا کہ اس کا انتظام میں کروں گا۔ اسنے گاؤں گاؤں جا کر مدرسوں کے لئے مکان حاصل کئے اور تھوڑے ہی دنوں میں قریب ڈھائی ہزار مکانوں کا انتظام کر لیا۔ اساتذہ کے لئے اس نے جدید قسم کا ٹریننگ کورس وضع کیا جس سے اس نے اٹھارہ مہینوں میں بارہ ہزار نئے استاد تیار کر دیئے۔ جہاں تک حکومت سے روپیہ حاصل کرنے کا تعلق تھا اس نے حکومت کے اس کمزور پہلو سے خوب فائدہ اٹھایا کہ اپنی نیک نامی کے لئے طٰہٰ حسین کو وزارت میں رکھنا چاہتی تھی۔ طٰہٰ حسین اپنی جیب میں ہر وقت اپنا استعفیٰ رکھتا تھا جونہی کسی مقام پر حکومت روپیہ دینے میں پس و پیش کرتی وہ جھٹ سے اپنا استعفیٰ نکال کر میز پر رکھ دیتا اسے استعفیٰ بھی واپس مل جاتا اور اس کے ساتھ مطلوبہ روپیہ بھی۔

وزیر تعلیم کی حیثیت میں ڈاکٹر حسین نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی بہترین کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں اور مصر کے سینکڑوں نوجوانوں کو امریکہ اور یورپ کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔

لیکن طٰہٰ حسین کے راستہ میں شاہ فاروق ایک سنگ گراں بن کر حائل تھا۔ طٰہٰ حسین کھلے بندوں شاہ فاروق پر اعتراضات کرتا اور کسی جائز تنقید سے کبھی نہ جھجکتا۔ حکومت نے اسکے میگزین کو بند کر دیا تاکہ وہ اپنے خیالات کو پھیلا نہ سکے۔ ایک دفعہ اسے ایک مضمون کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا لیکن عدالت نے اسے تھوڑے سے جرمانہ کی سزا دیکر چھوڑ دیا۔

جنرل نجیب نے شاہ فاروق کے خلاف ۱۹۵۲ء میں جو انقلابی قدم اٹھایا تھا ڈاکٹر حسین کا اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا یہ ایک خالص فوجی اقدام تھا اور اس زمانہ میں طٰہٰ حسین مصر میں موجود بھی نہیں تھا وہ اٹلی میں تھا۔ لیکن اسکے باوجود یہ حقیقت ہے کہ شاہ فاروق کے خلاف طٰہٰ حسین کی مسلسل کوششوں سے مصر کی فضا اس انقلاب کے لئے بالکل ہموار ہو چکی تھی۔

حسین آج قاہرہ کے نواح میں ایک سادہ سے مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسکی لائبریری میں فرانسیسی، یونانی، عربی زبان کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں جسے کوئی نہ کوئی اسے پڑھکر سناتا رہتا ہے۔ موسیقی سے اسے خاص شغف ہے وہ اپنا بیشتر حصہ تالیف و تصنیف کے کام میں گذارتا ہے۔ مصر کا ملک جتنے بڑے بڑے اعزازات کسی کو دے سکتا تھا وہ سب ڈاکٹر حسین کو دیئے جا چکے ہیں۔ اپنے ملک سے باہر آکسفورڈ روم، لیونز۔ اور دوسری بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے اسے آنریری ڈگریاں دی ہیں۔ بلجیم فرانس اور یونان کی حکومتوں نے اسے خاص عطیے دیئے ہیں۔ ایک دفعہ یہ تجویز بھی ہوئی تھی کہ اسے یونسکو (UNESCO) کا ڈائرکٹر جنرل بنا دیا جائے۔ لیکن اس کے ملک نے یہ کہکر اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ مصر کی آنکھوں کو اس اندھے کی بڑی ضرورت ہے۔

آج اس بچپن کے اندھے کے طفیل مصر کی مختلف درسگاہوں میں قریب بیس لاکھ طالبعلم بیک وقت تعلیم کی روشنی سے اپنی آنکھیں ستنیر کرتے ہیں۔

(ماخوذ از ریڈرز ڈائجسٹ)

طلوع اسلام

خدا کرے کہ پاکستان کو بھی کوئی اسی قسم کا بالغ نظر اندھا مل جائے جو ان تاریکیوں کو دور کر سکے جو یہاں کے آنکھوں والوں نے اس بری طرح سے پھیلا رکھی ہیں!

پاکستان، غیروں کی نظر میں

(صفحہ ۱۱ سے آگے)

تک کم ہو سکیگا (گو مسٹر سہروردی کی موجودگی اس خطرناک خلا کو پر کرنے کے لئے زیادہ مفید ہوگی۔) جنرل اسکندر مرزا بھی پاکستان کے قائم مقام گورنر جنرل اعوان کا سا مزاج رکھنے والے بعض دیگر لوگ جذبات کے لحاظ سے نرم ہیں تو عمل کے اعتبار سے سخت ہیں۔ ان کے دم سے ایک سرگرم اور صاف ستھری حیثیت حاکمہ بن سکتی ہے وہ اس کے بھی ضامن ہوں گے کہ اگر پارلیمنٹ کو بھی جھٹکا لگے تو اس سے ملک کی کمر نہ ٹوٹ جائے۔

مسٹر غلام محمد جنھوں نے اس ہفتے جنرل اسکندر مرزا کے لئے اپنی جگہ خالی کی ہے ۱۹۵۱ء میں گورنر جنرل بنتے وقت بھی اچھی صحت کے مالک نہیں تھے۔ لیکن اس مریض نے جس معقولیت اور جرأت سے اپنی قوت کا استعمال کیا وہ حیرتناک ہے۔ ان کے دلیرانہ احکام نے جو سرگوشیوں میں جاری ہوئے کئی سیاسی طوفانوں کو خاموش کر دیا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی جانتے تھے کہ پاکستان کے ابتلاء کا دور ہنوز ختم نہیں ہوا۔ کم از کم ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ناؤ ٹھہرے ہوئے پانی میں داخل ہو گئی ہے۔ ایسی توقع شائد اس وقت کی جا سکے جب عمومی انتخابات منعقد ہو جائیں گے۔ یہ آئندہ سال کے خاتمے سے پہلے ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود اب جبکہ خرابی صحت کی بنا پر مسٹر غلام محمد اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے ہیں (؟) انھیں اس کا اطمینان ہونا چاہئیے کہ انھوں نے پاکستان کو آزادی ہی عطا کی اور استواری بھی۔ اس کا معاشی بحران ترچکا ہے اور بحران کے بعد کی کمزوری بھی رفع ہو رہی ہے۔ اس کے سیاسی مستقبل پر بے یقینی کے جو دبیز پردے پڑ گئے تھے وہ ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں۔ اور وہ اپنا جانشین ان افراد کو چھوڑ رہے ہیں جن کے سپرد یہ فریضہ ہے کہ کشتی ملت کو ایک طرف جمود اور انتشار کے خطرے سے بچائے جائیں اور دوسری طرف اسے آمریت کی موجوں کے حوالہ نہ کر دیں۔ آخر الذکر صورت نظری اعتبار سے شائد ترقی پسندانہ دکھائی دے لیکن اس سے ان اعتدال پسندانہ جذبات کی تسکین نہیں ہوگی جو قائدین اور عوام دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ مسٹر غلام محمد نے کشتی ملت کو اس سفر کے لئے تیار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور اب باد موافق بھی چلنا شروع ہو گئی ہے!

دستور پاکستان

قرآن نظام معاشرت کا جو نقشہ پیش کرتا ہے اس کی رو سے۔

(۱) تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری حکومت کے سر ہوتی ہے۔

(۲) وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ وہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہتے ہیں۔ تاکہ مملکت ربوبیت عامہ کی کفیل ہو سکے

طلوع اسلام میں اس نظام کی تفصیل اور تشکیل سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس پر خصوصیت سے کتاب

"نظام ربوبیت"

میں بحث کی گئی ہے۔

اگر آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ پاکستان میں ایسا ہی نظام رائج ہونا چاہئیے تو آپ مجلس دستور ساز سے مطالبہ کیجئے کہ آپ یہی اور صرف یہی نظام چاہتے ہیں

بین الاقوامی جائزہ

(ص ۶ سے آگے)

لے سنگمن ری کی تسلی کے لئے کچھ فوج جاپان سے لاکر جنوبی کوریا میں متعین کر دی ہے۔ اس میں مصلحت یہی ہے کہ جنوبی کوریا زیادہ شور نہ مچائے اور امریکہ کی توجہ چین کے مذاکرات سے ہٹ کر کوریا میں جذب ہو جائے۔ بعض حلقوں میں یہ کہا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر سنگمن ری امریکہ اور چین کے مذاکرات کو پسند نہیں کرتے اور اس کے لئے انہوں نے یہ شورش چھوڑا ہے۔ تاکہ ایسا ہنگامہ پیدا ہو جائے جس سے مذاکرات ناکام ہو جائیں۔ اگر یہ ہنگامہ فرو نہ ہو گیا تو ان مذاکرات پر یقیناً برا اثر پڑے گا۔ چین نے جاپان پر بھی ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں

اور جاپان نے معاہدہ امن کی مذمت کرنے کے باوجود تجارتی تعلقات کی استواری کے لئے آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ جاپان عجیب دور سے گذر رہا ہے اس کی تجارتی قریبی اور قدرتی "منڈی" چین ہے۔ لیکن چین سے تجارت سیاست کا اہم مسئلہ بن گئی ہے۔ کیونکہ جاپان امریکہ کا حلیف ہے اور امریکہ سے ہی وابستہ رہنا چاہتا ہے چین جاپان کے مال کا ضرورت مند ہے۔ لیکن وہ تجارت کے بہانے جاپان کو امریکہ سے علیحدہ بھی کرنا چاہتا ہے۔ جاپان تجارتی لحاظ سے چین کی طرف دیکھتا بھی ہے لیکن وہ زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کر رہا۔ اس کی بہت حد تک وجہ چین کا رویہ ہے۔ حال ہی میں چین کی طرف سے کہا گیا ہے کہ (۱) جاپان سے تاوان جنگ لینے کا حق چین کو حاصل ہے (۲) جو چھ ہزار جاپانی قیدی چین میں ہیں

وہ جاپان واپس نہیں جانا چاہتے۔ اور (۳) جو چینی جاپان میں مقیم ہیں جاپان انھیں چین واپس آنے نہیں دیتا۔ اس بیان سے جاپان میں سرد مہری پیدا ہو گئی ہے کیونکہ چین اگر اس موقف پر قائم رہا تو جاپان کو مذاکرات سے کچھ فائدہ ہونے کی بجائے الٹا نقصان ہوگا۔ جاپان کا مسئلہ بہر حال اتنا آسان نہیں کہ اس کا یوں حل نکل آئے۔ چین کو اس سلسلہ میں کافی پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔

یورپ میں جرمنی کا مسئلہ بدستور لاینحل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ شرق و مغرب کی مفاہمت کا دارومدار بہت حد تک اس کے تصفیہ پر ہے ڈاکٹر اڈینار کو ماسکو کی دعوت مل چکی ہے اور وہ جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں لیکن ایسے نظر آتا ہے کہ ان کے مطالبات کو روس تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ایک تو اپنا یہ حق تسلیم کراتے ہیں کہ وہ مغرب کے حلیف رہ سکتے ہیں، دوسرے وہ وحدت پر بھی زور دے رہے ہیں اور روس کی تحویل میں جرمن قیدیوں کی واپسی کے بھی مصر ہیں بہر حال ماسکو جانے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روس بالآخر جرمنی کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے؟

اسلامی معاشرت

مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ

قیمت ——— دو روپے

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش ——— قیمت — بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۰۰۰ صفحات ——— قیمت — آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات ——— قیمت ——— دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ——— قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات قیمت ——— چار روپے

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے منظومات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر سات سالہ دور آزادی کی منہ بولتی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہے؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت ——— چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد ——— چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطہ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۰۰ صفحات ——— قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات ——— قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر پہلو قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ ——— قیمت دو روپے

نظام ربوبیت — از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دور حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔
قیمت قسم اول ——— چھ روپے قسم دوم ——— (غیر مجلد) ——— چار روپے

اقبال اور قرآن — از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ دست کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۴۴ – کراچی

نقد ونظر

تازیانے ضخامت دو سو اٹھاسی صفحات سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت مجلد تین روپے ملنے کا پتہ۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔

یہ کتاب عربی کی ایک کتاب "المنبہات" کا ترجمہ ہے جس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس کی تصنیف ہے تاہم ناشر صاحب نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ وہ زین القضاۃ احمد بن محمد الحجی کی تصنیف ہے۔ اس میں حکمت و موعظت سے متعلق بہت سی کام کی باتیں آگئی ہیں جو رسول اللہ صلعم اور حضرات صحابہ اور بزرگان دین اور حکمائے عالم کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ جہاں تک اس نسبت کا تعلق ہے ناشر صاحب کو خود ہی اعتراف ہے کہ اس کتاب میں متعدد ایسی روایات بھی آگئی ہیں جو محض واعظانہ ہیں اور شاید صحت کے معیار پر پوری نہ اتر سکیں۔ اس حیثیت سے قطع نظر جہاں تک حکمت و موعظت کا تعلق ہے اس میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بعض بہت کارآمد باتیں آگئی ہیں۔ عربی آموز طلباء کے لئے ان کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ کتابت و طباعت گوارہ ہے۔ مگر کاغذ معمولی ہے۔

سیرتِ پاک ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ تقطیع خورد۔ قیمت مجلد ایک روپیہ ۲ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ کارخانہ تجارت کتب بالمقابل آرام باغ۔ فریر روڈ کراچی

بچوں کے لئے چھوٹی تقطیع کی ایک مختصر سی سیرت رسول ہے جو بشیر محمد شارق صاحب دہلوی کی ترتیب دی ہوئی ہے جہاں تک ترتیب اور انداز تحریر کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ کتابت گوارہ ہے لیکن بچوں کے لئے موزوں نہیں ہے کاغذ سفید کرنا فلی ہے۔ مگر طباعت کچھ بہتر ہوتی تو اچھا تھا

ہفتہ وار "دلچسپ" مدراس یہ ایک ہفتہ وار اخبار ہے۔ جو مدراس سے زیر ادارت محمد اسمٰعیل عبد الکریم سیٹھ شائع ہوتا ہے اس کا ایک پرچہ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۵۵ء ہمارے زیر نظر ہے۔ ضخامت اٹھائیں صفحات ہے۔ مضامین میں تنوع ہے۔ زیادہ تر مضامین دیگر اخبارات و رسائل سے ماخوذ ہیں۔ مگر مدراس جیسے شہر سے اردو کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا ہمت کا کام ہے۔ اور اس کے لئے ہم اس اخبار کے منتظمین کو در خور مبارکباد سمجھتے ہیں

امیر اندلس ہماری تاریخ نے عزم و شجاعت کے اعتبار سے جو نامور ہستیاں پیدا کی ہیں۔ ان میں امیر عبد الرحمٰن بانی سلطنت اندلس کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ یہ جن ناساعد حالات میں اپنے وطن سے نکلا اور جن جانکاہ مشقتوں کے بعد اس نے اندلس جیسی دور دراز سرزمین میں ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی وہ تاریخ کا نمایاں کارنامہ ہے۔ زیر نظر کتاب میں اسی امیر اندلس کے سوانح حیات ایک ناول کے انداز میں پیش کئے گئے ہیں اس انداز کا نتیجہ ہے کہ واقعات میں افسانوی رنگ آگیا ہے لیکن اس سے کتاب کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ اس کے مصنف علی اصغر چودھری ہیں۔ اور ناشر انار کلی کتاب گھر لاہور۔ طباعت، کتابت عمدہ۔ کاغذ سفید ضخامت اڑھائی سو صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپیہ۔

ماہنامہ عفت مقام اشاعت۔ ادارہ خواتین اچھرہ لاہور۔ قیمت سالانہ پانچ روپے فی پرچہ آٹھ آنے

چھوٹے سائز پر ۴۸ صفحات کا ایک زنانہ ماہوار رسالہ ہے مضامین زیادہ تر تہذیب جدید کے خلاف احتجاج پر مبنی ہیں اور بہت پھیکے ہیں مثلاً ابتدا میں ایک افسانہ ہے "چلتے دیئے" جو ایک مغرب زدہ خاتون سے متعلق ہے جو بعد میں پردہ نشین ہو گئیں اور ان کے شوہر جو ایک ڈاکٹر (پی، ایچ، ڈی) ہیں وہ چہرہ پر ڈاڑھی رکھنے لگے ہیں مگر افسانہ نگار نے اس اہم تبدیلی کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔

ایک دوسرا مضمون "بڑا وقت" ہے جس میں تعلیم نسواں کی محض اس بنیاد پر مخالفت کی گئی ہے کہ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کافی عمر صرف ہو جاتی ہے اور پھر انھیں اچھا بر نصیب نہیں ہوتا، کتابت، طباعت اور کاغذ بہتر ہے

بچوں کی صحت کا محافظ جس میں اب پانچ ضروری حیاتین شامل ہیں

ہمدرد ترقی کا قائل ہے۔ اور یہی سب سے اچھی روایت ہے۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں ہم طب میں نئے انکشافات سے بھی کام لے رہے ہیں تاکہ اس فن کو اور زیادہ مفید بنایا جا سکے اور یہ صحیح معنوں میں ایک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر علم ثابت ہو سکے۔

نونہال میں حیاتین (وٹامینز) شامل کر دیئے گئے ہیں اور اب نونہال بچوں کے لئے پہلے سے بھی زیادہ فائدہ مند بلکہ لازمی ہو گیا ہے کیونکہ بچپن میں اچھی صحت اور جسمانی نشو و نما کے لئے ان اجزائے خوراک کی مسلسل ضرورت رہتی ہے۔

ہمدرد

بابُ المراسلات

انقلاب آفریں حالات!

ایک صاحب بصیرت دوست جن کے دل میں اسلام اور پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، چند دن سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ وہاں کے تاثرات اسطرح لکھتے ہیں

کوئی تین ہفتہ ہوگئے۔ جو دیکھا اس پر تعجب نہیں لیکن روح کا زخم گہرا ہوتا جارہا ہے یہ سادہ دل بامروت پرخوت بندے معاشرہ کی بدحالی سے پست اقوام کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں۔ اکثر خیال آتا ہے خدایا کیا یہ وہی سرزمین ہے جہاں علامہ اقبال نے قرآن کی شمع روشن کی تھی جہاں پرویز نے جنم لیا اور باد مخالف کے باوجود وہ کتاب اللہ کا کنول جلائے ہوئے ہے، جہاں میں مقیم ہوں وہاں ایک نامکمل سی مسجد ہے جس پر ۸ ہزار خرچ ہوچکا ہے لیکن اسی مسجد کے سابقہ امام مرحوم کی بیوہ مع ایک اپاہج بچے کے روٹی کو محتاج ہے۔ اور کوئی خبر نہیں لیتا۔ کوئی اس کو اہمیت بھی نہیں دیتا۔ آخر وہ کونسا تقویٰ ہے جس پر کسی مسجد کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے اور سجود ان ممبروں اور محرابوں سے کیا حاصل اگر خدا کی محبوب ترین مخلوق کا ایک فرد بھی بھوکا ہے لیکن ایک خلقت ہے کہ روایات کی گرد اور تقلید کی دھول میں لپٹی ہوئی چلی جارہی ہے۔ پانچ وقت اللہ اکبر کہتی ہے لیکن نہیں جانتی کہ اللہ اکبر کی توثیق اس معاشرہ کے ذریعہ ہی ہوتی ہے جس کی اساس خدا کے قانون پر ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک قافلہ ریگستان میں بھٹکتا چلا جارہا ہے۔ بلا منزل، بلا مقصد۔ قرآن کا ذکر کرو تو اسلاف سے عقیدت جتلاتے ہیں۔ نماز کی حقیقت تا قائم ادائے رسم سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ ۹ کروڑ کی اس آبادی میں کوئی مرد رشید نہیں اٹھتا جو انسانیت کو اس بار سے آزاد کرے۔ بعض مرتبہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو بے اختیار حالی کی مناجات کا یہ مصرع ذہن میں آتا ہے۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے۔

معاشی اور معاشرتی ابتری کا حال نہ پوچھئے۔ ہر شعبہ میں ایک جانسوز ابتذال ہے۔ بس وقت پر نہیں چلتی۔ چیز قیمت پر نہیں ملتی۔ دوا بے اثر۔ دعائیں بے ثمر، میں اپنی سی کئے جاتا ہوں لیکن ایک دن ڈر ہے یہ پھوڑا پھوٹ جائیگا اور آپ شائد مجھے ایک مکمل انقلابی پائیں۔ عقل آخر کب تک ساتھ دیگی

طلوع اسلام

ضرور انقلابی بنیے کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ لیکن قرآنی انقلاب کے داعی جس میں خود عقل ہی انقلاب کی اساس بن جاتی ہے اور جس کا نتیجہ بلا تخریب تعمیری ہوتا ہے

طلوع اسلام کا چندہ

ایک صاحب جنھوں نے اپنا نام اور پتہ نہیں لکھا، تحریر فرماتے ہیں۔

میں طلوع اسلام ہفت روزہ کے بارہ میں اپنے ناقص خیالات ایک مشورہ کے طور پر پیش کرتا ہوں توافق یا تضاد کا آپ کو اختیار ہے ہی۔

طلوع اسلام کوئی ایسا مسلک پیش نہیں کررہا جس کے پس پردہ ذاتی مفاد یا انفرادی منفعت ہو اور نہ ہی اپنی جاذبیت یا مقبولیت کے لئے عوام کے رجحان کا خیال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عوام کا مجلہ نہیں بلکہ انسانوں کے ایک مختصر سے گروہ کی امیدوں کا مرکز ہے۔ اور ایسے انسان ہر دور میں نایاب یا بہت ہی کم ہوتے ہیں جو ایک عالمگیر مسلک کے لئے پیہم جدوجہد جاری رکھنا اپنا مقدس فریضہ سمجھتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد طلوع اسلام نے جو کام کیا وہ اہل بصیرت ہی جانتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس ادارہ کی مالی کمزوریوں کا احساس بھی ضرور تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ چھ روپے (سالانہ چندہ) ادارہ کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ مگر "ادارہ" چونکہ جفا طلبی اور جانفشانی سے حالات کی انتہائی ناساعد صورت میں بھی اپنے فرائض سے عہدہ برا ہوتا رہا اس لئے اس سلسلہ میں دست معاونت دراز کرنیوالوں میں سے بھی چند ہی جانثاروں نے رسالہ کا چندہ بڑھانے کی تجویز پیش کی ہوگی۔

حالات کی رفتار کے ساتھ رسالہ کا ہفتہ وار ایڈیشن واقعی ناگزیر تھا اور یہ بھی درست ہے کہ طلوع اسلام ہفت روزہ کا سالانہ چندہ گزشتہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بہت کم رکھا گیا تھا جسے اب یک لخت بڑھا کر پندرہ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ اور یکم اگست سے یہ ترمیم عمل میں لائی گئی۔

اس سلسلہ میں میری ذاتی رائے ہے کہ:۔ طلوع اسلام صرف اونچے طبقہ تک ہی محدود ہوکر رہ جائیگا۔ اور وہ لوگ جو محدود معاشی ذرائع کے مالک ہیں اس بار کو ناقابل برداشت سمجھکر ہمت ہار جائیں گے۔ حالانکہ جن لوگوں کے دلوں میں یہ آواز جلد اترتی ہے وہ مفلوک الحال اور پسماندہ زندگی بسر کر رہے ہیں ورنہ جو لوگ آج عیش کی زندگی گزار رہے ہیں ان کے لئے ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے نہ معاشی ناہمواریوں کا سدباب لازمی علاوہ ازیں۔ ابھی تک یہ آواز صرف پاکستان کے ہر کونے تک اچھی طرح نہیں پہنچ سکی۔ حالانکہ اس کے مستحق اس مملکت میں بسنے والے انسان ہی نہیں بلکہ ہر انسان بلا تفریق ملک و ملت ہے۔

اس لئے ادارہ کی معاشی مشکلات کا حل چندہ کے اضافہ سے نکالنا میرا خیال ہے مفید نہ ہوسکے گا بلکہ ان مجبوریوں کو دور کرنے کے لئے اگر غیر مشروط طور پر ہی مدد مانگی جاتی تو آپ کی مجبوریوں کا علاج ہوجاتا۔ چونکہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو قرآن کی عظمت کو سمجھتے ہیں۔ وہ جس طرح حدیث اور قرآن کی تفریق پر غور کررہے ہیں اسی طرح طلوع اسلام اور جماعت اسلامی کے لٹریچر کا توازن کررہے ہیں۔ اندریں حالات اپنی مجبوریوں کو مزنظر رکھئے طلوع اسلام کی وساطت سے یا معاونت سے غور کیجئے جو لوگ مشن کا پرچار کرتے ہیں ان کا لٹریچر ہمیشہ سہل الحصول ہوتا ہے۔ اسلئے طلوع اسلام کے بڑھتے ہوئے خریداروں کو روکنے کے بجائے رسالہ کی قیمت کو یا تو بحال رکھا جائے اور یا بارہ روپے سالانہ کردیا جائے۔ ورنہ طلوع اسلام کی خریداری کی رفتار انتہائی مایوس کن صورت اختیار کرے گی۔ وہ لوگ جو بھوک کی وجہ سے قوت سامعہ ہی کھو بیٹھے ہیں وہ اتنا مہنگا لٹریچر شائد ہی خرید سکیں ذرا غور فرمائیے کہ یہ کہاں تک درست حقیقت ہے۔

ہمارے آزاد کشمیر میں یہ ایک غیر مانوس آواز ہے جسے ملاّ انتہائی زور سے باہر دھکیلنے میں مصروف ہے۔ ایسے حالات میں طلوع اسلام کو زیادہ سے زیادہ سہل الحصول ہونا چاہئے تاکہ وہ بجلی کی روشنی میں ہی نہیں بلکہ دیئے کی مدد سے بھی پڑھا جاسکے۔

(ایک ہم خیال)

طلوع اسلام

اگر آپ ہم سے پوچھیں تو طلوع اسلام جس مشن کو لیکر اٹھا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ پرچہ اور اس کے لٹریچر کو بلا قیمت گھر گھر پہنچایا جائے۔ لیکن ہمارے معاشی دور (AGE OF ECONOMICS) کے تقاضے یہ ہیں کہ سانس لینے تک کیلئے بھی پیسہ دیجئے۔ جنھوں نے اس مشن کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے وہ اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے لیکن جو کچھ قیمت پر خریدنا پڑتا ہو اس کی قیمت بہر نوع ادا کرنی پڑتی ہے اور اس کے لئے پرچہ کا چندہ اور لٹریچر کی قیمت لی جانی ناگزیر ہوجاتی ہے۔ آپ تصور نہیں فرما سکتے کہ ہم نے کن حالات میں چندہ بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے؟ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ بات طلوع اسلام کی زندگی اور موت تک آپہنچی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر طلوع اسلام کی نبض اس طرف

(باقی ص۱۸ پر)

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس* روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح — — —

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

* پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

★ ★ ★

تاریخ الامّت

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کی وہ گراں قدر تالیت جو تقسیم سے بیشتر ہندوستان کی اکثر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔ طلوع اسلام نے جناب مولف کی اجازت خاص سے اس نایاب کتاب کو دوبارہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ آٹھ حصوں میں سے دو حصے چھپ چکے ہیں۔ پہلا حصہ سیرت الرسول پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ خلفائے راشدین سے متعلق۔

قیمت حصہ اول دو روپے
قیمت حصہ دوم دو روپے آٹھ آنے } علاوہ محصول ڈاک۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

روٹی کا مسئلہ

انسان کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے - اس کی اہمیت
ہمیشہ سے چلی آرہی ہے -

انسان نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بڑے جتن کئے - لیکن
یہ اور الجھتا چلا گیا -

انسان نے اس کے حل کے لئے جو کچھ کیا اس سے اس کا

بدن زندہ رہ سکا

لیکن اس نے اپنی جان کو رہن رکھ دیا -

اب سوال یہ ہے
کہ کیا تدبیر اختیار کی جائے کہ انسان کا بدن اور اس کی جان
دونوں سلامت رہیں -

اس کے لئے ہمیں قرآن کیطرف رجوع کرنا ہوگا -

قرآن کا حل

☆ نظام ربوبیت ☆

(از - پرویز)

سیں سلیگا جوبلا شبہ دور حاضرہ کی عظیم کتاب ہے -

قسم اول : کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھ روپے
قسم دوم : کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ - چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۷ - کراچی-۳

Title Printed at Musid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi.
Editor: KHURSHID ALAM